انتخاب مستقل: مرتبہ جناب محمد حامد علی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۰۸، قیمت چار روپے، پتہ: اترپردیش اردو اکیڈمی، بہرہ ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ۔

مولانا حسرت موہانی طرفہ تماشا طبیعت کے مالک تھے، ان کے یہاں علم وادب اور شعروسخن کے چمنستان کے ساتھ سیاست کا خارستان بھی نظر آتا ہے، انہوں نے اردوئے معلی اور تذکرۃ الشعراء کے علاوہ ایک سیاسی اخبار بھی "مستقل" کے نام سے نکالا تھا جس کے فائل اب کمیاب ہیں، حسن اتفاق سے اس کے اکثر پرانے شمارے ایک صاحب ذوق رئیس اور آل انڈیا حسرت اکیڈمی گورکھپور کے صدر جناب حامد علی صاحب کے ذاتی کتب خانہ میں موجود تھے، جس کے اداریوں کا یہ انتخاب انہوں نے اترپردیش اردو اکیڈمی کے لائق چیرمین ڈاکٹر محمود الہی کی فرمایش پر کیا اور اکیڈمی نے اسے اہتمام کے ساتھ شائع کیا، ان اداریوں میں گذشتہ نصف صدی قبل کے اہم قومی، ملی اور سیاسی واقعات ومسائل پر حسرت نے بے لاگ اظہار خیال کیا ہے، ان سے ان کی طبیعت کے خاص رنگ کا بھی پتہ چلتا ہے، اور ان کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کی عکاسی بھی ہوتی ہے، شروع میں مرتب کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں حسرت کی صحافت اور "مستقل" کے متعلق مفید اور ضروری معلومات قلمبند کئے گئے ہیں اور اس کے مضامین اور اداریوں کی خصوصیات پر بھی مناسب انداز سے بحث وگفتگو کی گئی ہے، اس انتخاب کی حیثیت ایک سیاسی دستاویز کی ہے جس کی اشاعت پر لائق مرتب اور اترپردیش اردو اکیڈمی دونوں تحسین کے مستحق ہیں۔ ایک جگہ لکھا ہے "اوائل ۱۹۲۰ء میں حسرت علی گڑھ منتقل ہونے پر..." (ص ۱۳) یہ سہو قلم ہے، وہ تو اس سال علی گڑھ کو خیرباد کہکر کانپور منتقل ہوئے تھے۔

بچے اور اسلام: از مولانا سید جلال الدین صاحب انصر عمری، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۱۶، قیمت ۵۰ پیسے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۶۔

۱۹۷۹ء میں اقوام متحدہ کی تحریک سے پوری دنیا میں بچوں کا سال منایا گیا تھا، یہ کتابچہ اسی تقریب کیلئے لکھا گیا تھا، جسمیں بچوں کے بارہ میں ضروری اسلامی تعلیمات درج ہیں جیسے قتل اولاد کی ممانعت، عقیقہ، اذان، اولاد کی پرورش، تعلیم وتربیت نیز یتیم اور

جلد ۱۳۲ ماہ شوال المکرم ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۳ء عدد ۲

مضامین

شذرات

مقالات

ادبیات

تذکرۃ المحدثین

حصۂ اول ودوم، مرتبہ ضیاء الدین اصلاحی، قیمت علی الترتیب ۱۹ روپئے و ۲۴ روپئے

شذرات

آہ! مولانا قاری محمد طیبؒ!

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ کی وفات کا غم ابھی فراموش نہ ہوا تھا کہ ایک اور آفتاب علم و ہدایت غروب ہو گیا، یعنی مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو اس جہانِ فانی کو الوداع کہا، اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔ وہ ممتاز عالم دین تھے، ان کی شہرت سے یہ برصغیر ہی نہیں، پوری اسلامی دنیا گونج رہی تھی، انکی وفات سے ہماری ملی، دینی، علمی اور تعلیمی عمارت کا بہت بڑا ستون گر گیا، اور جماعت دیوبند کی ایک قدیم اور اہم یادگار مٹ گئی، وہ اس قافلہ کے آخری مسافر تھے جس کا آغاز خاندان ولی اللّٰہی سے ہو کر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلفا، اور دارالعلوم دیوبند کے اکابر تک پہنچا تھا، افسوس اب علم و عرفان کی وہ شمع گل ہو گئی جس سے دارالعلوم نصف صدی سے جگمگا رہا تھا، والبقاء للہ وحدہ۔

وہ دارالعلوم کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پوتے اور مولانا حافظ محمد احمدؒ کے صاحبزادے تھے، جو دارالعلوم دیوبند کے پانچویں مہتمم اور چار برس تک ریاست حیدرآباد دکن کی عدالت عالیہ کے مفتی تھے، قاری صاحبؒ کی پرورش و پرداخت اسی مقدس خانوادہ اور دارالعلوم کے اس عہد زریں میں ہوئی جو علمی، تعلیمی، دینی اور روحانی حیثیت سے بے مثال تھا، اور جب اسکا آسمانِ علم و کمال متعدد مہر و ماہ سے جلوہ فگن تھا، ان کی ولادت ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء میں ہوئی، تاریخی نام مظفر الدین تھا، سات برس کی عمر میں دارالعلوم میں داخل کئے گئے، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور دوسرے نامور فضلاء کی موجودگی میں مکتب نشینی اور بسم اللہ کی تقریب عمل میں آئی، دو ہی برس میں قرآن مجید تجوید و قراءت کے ساتھ حفظ کر لیا، پانچ برس درجۂ فارسی میں رہے، اسکے بعد عربی شروع کی، آٹھ برس میں درسیات سے فارغ ہو کر ۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۸ء

میں دارالعلوم سے سند فضیلت حاصل کی، اور وہیں مسند درس پر متمکن ہو گئے، جسکا سلسلہ آخر تک جاری رہا، تفسیر و حدیث اور علم اسرار الدین کی کتابیں خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ ہمیشہ انکے زیر درس رہتیں، بزرگوں کی جوہر شناسی سے ۱۳۴۱ھ میں دارالعلوم کے نائب مہتمم اور چند ہی برس بعد مہتمم بنا دیئے گئے، جس کے وہ پوری طرح اہل ثابت ہوئے،

مولانا محمد طیب صاحب تقریباً ساٹھ برس تک دارالعلوم کے مہتمم رہے، اس طویل مدت میں بڑے نازک دور آئے، مگر انہوں نے دارالعلوم کو ہر خطرہ سے بچایا اور اس پر کوئی آنچ نہ آنے دی، ان کے دور میں اسکی شہرت و عظمت میں چار چاند لگ گئے، اور وہ ترقی کے بام عروج پر پہنچ گیا، انہوں نے اسکا آوازۂ شہرت پوری دنیائے اسلام اور ایشیا، یورپ، امریکہ اور افریقہ کے ملکوں تک پہنچا دیا، وہ دارالعلوم کے مقصد و مسلک کی اشاعت اور دین کی تبلیغ کیلئے برابر سفر کرتے رہتے تھے، اسکی وجہ سے دارالعلوم کا حلقۂ اثر بہت وسیع ہو گیا، اور ہر جگہ کے خواص تو درکنار عوام بھی اس سے اچھی طرح روشناس ہو گئے، اور وہ ملکی عالمگیر اور بین الاقوامی ادارہ بن گیا، اسے جامع ازہر پر بھی اس حیثیت سے برتری حاصل ہے کہ حکومت کی اعانت اور سرپرستی کے بغیر محض توکل علی اللہ اور مسلمانوں کے عام چندے سے چل رہا ہے۔

تقریر و تحریر کا اچھا ملکہ تھا، بڑے خوش بیان واعظ تھے اور اسمیں ان کا طوطی بولتا تھا، پورے ملک میں انکی خطابت کی دھوم تھی، اس کیلئے بیرون ملک سے بھی دعوتنامے آتے، وہاں بھی انکی تقریریں پسند کی جاتی تھیں، دو دو تین تین گھنٹے تک انشراح و نشاط کے ساتھ مسلسل تقریر کرتے، اور بات میں بات پیدا کر کے پورا سماں باندھ دیتے، دقیق موضوع پر بھی بولتے تو انکا نکتہ آفریں دماغ اور مواج ذہن معلومات کا دریا بہا دیتا، تقریریں اتنی موثر اور دلپذیر ہوتیں کہ سننے والے کو کوئی اکتاہٹ اور گھبراہٹ نہ ہوتی، حقائق و اسرار کا بند قفل کھول دینے اور مشکل مضامین کی تفہیم پر بڑی قدرت تھی، اس حیثیت سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی مقبول تھے، وہ بھی انکے حکیمانہ و متکلمانہ اسلوب سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، انکی تصنیفات میں بھی یہی رنگ غالب تھا، جو جدید طبقہ کے شکوک و شبہات کا ازالہ کر دیتا، تحریر کی مشق بھی طالب علمی ہی کے زمانہ میں ہو گئی تھی، ابتدا میں "القاسم" میں مضامین

لکھتے، عموماً تصنیف و تالیف اور مقالہ نگاری کا کام دوران سفر میں انجام دیتے، وہ شاعر بھی تھے مگر انکے شاعرانہ کمال پر پردہ پڑا رہا، عرفان عارف کے نام سے ان کے کلام کا ایک مجموعہ بھی چھپا تھا۔

وہ پہلے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے بیعت ہوئے، مگر چند ماہ بعد ہی انکا انتقال ہوگیا، تو وقت کے نامور شیخ طریقت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے متوسل ہوگئے، اور ۱۳۵۰ھ میں ان سے خلافت بھی پائی، انکے سرچشمہ فیض سے بھی ہزاروں تشنگان معرفت سیراب ہوئے،

نام کیطرح شکل و صورت اور سیرت و کردار کے بھی طیب تھے، ظاہری نفاست اور حسن و جمال کے ساتھ پاک دل اور پاک طینت بھی تھے، ان کے مخالف بھی انکی نیکی، شرافت، تحمل، نرم خوئی اور عفو و حلم کے معترف تھے، اپنے خلق عظیم اور لطف عمیم کیوجہ سے ہر مسلک کے لوگوں میں مقبول تھے، اور انکی ذات اختلافات سے بالاتر سمجھی جاتی تھی چنانچہ ابتدا سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے متفق علیہ صدر رہے۔

مولانا قاری محمد طیب اور دارالعلوم دیوبند ایک ہی اسم کے دو مسمّٰی تھے، مگر زندگی کے آخری دنوں میں انہیں دارالعلوم کی جدائی کا صدمہ اٹھانا پڑا، وفات سے دو ماہ پہلے بستر علالت سے لکھے ہوئے ایک خط میں دارالعلوم کیلئے اپنی تڑپ، بیقراری اور تشویش کا اس طرح اظہار فرماتے ہیں: "نہ اپنی ذات کا غم ہے نہ اپنے عزیزوں کا غم بلکہ غم دارالعلوم کا ہے، عجب جو ایک سو سولہ [116] برس تک اوروں کیلئے ہدایت، تقوٰی اور توحید کی علامت تھی بکھر کر رہ گئی ہے، یہی میری بیماری ہے۔۔ زندگی کی آخری آرزو اور آخری دعا یہ ہے کہ دارالعلوم کا پہلا رنگ جسمیں روحانیت تھی، خلوص تھا اور سب ایک تھے اور فیصلے ایک رائے سے ہوتے تھے پھر بحال ہوجائے" کاش انکی دعا قبول ہوتی اور وہ حسرت لیکر دنیا سے نہ جاتے، دارالعلوم اور مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی سب سے قیمتی متاع ہیں جن سے وہ فقیری میں بھی امیر ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنوں کی ناعاقبت اندیشی ان دونوں کی تباہی کا موجب بن جائے۔

بارالہٰا! دین اور علم دین کے خادم، شریعت و طریقت کے محرم، علوم و معارف قاسمی کے امین، اور مسلک دیوبند کے شارح و ترجمان کی تربت کو اپنے انوار رحمت سے منور اور جنت الفردوس کے پھولوں سے معطر فرما۔ اللّٰھم صبّ علیہ شآبیب رحمتک و رضوانک یا ارحم الراحمین۔

مقالات

مستشرقین اور سیرت نبوی

از: ڈاکٹر عماد الدین خلیل، موصل یونیورسٹی، عراق

مترجمہ: حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی، رفیق دار المصنفین

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق مستشرقین کے موقف کی تشکیل ایک ایسے دینی دائرہ کے اندر ہوتی ہے، جس میں قومی تعصب، ذہنی تشنج، بغض و کینہ اور نفرت و کدورت کی کارفرمائی ہوتی ہے، اور ان کی ارادی و غیر ارادی دونوں طرح کی جہالت اس کا احاطہ کئے ہوتی ہے، اسی لئے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شخصیت اور عام لوگوں کے درمیان ناقابل عبور گھاٹیاں اور تہ بہ تہ تاریکیاں حائل ہوگئی ہیں، غرض رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق مستشرقین کی بحث و تحقیق اور ان کا مطالعہ و تجزیہ نہ معروضی موضوعی ہے اور نہ تاریخی و علمی، بلکہ وہ سب و شتم کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، جس میں کلیسا کی دینی اور تقدس مآب شخصیتوں کے ساتھ غیر دینی اور لامذہبی افراد بھی برابر حصہ لیتے رہے ہیں، اور یہ سیلاب بلا خیز آج تک رواں ہے۔

مستشرقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو کچھ ہرزہ سرائی کی ہے، اسے بطور استشہاد پیش کرنے کے لئے بھی طبیعت آمادہ نہیں ہوتی ہے، اور قلم میں لرزش پیدا ہوجاتی ہے، مگر نقل کفر کفر نباشد کے بموجب ان کے بعض ہفوات نقل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا، یہ خیالات دور جدید کے

مستشرقین کے ہیں، جن میں سے بعض ابھی بقید حیات بھی ہیں، ایک مستشرق موسیو پیور گولی اپنی کتاب "البحث عن الدین الحق" میں لکھتے ہیں

"مشرق میں ایک نئے دشمنِ اسلام کا ظہور ہوا، جس کی بنیاد اور تعمیر طاقت اور شدید تعصب پر قائم ہے، محمدؐ نے اپنے پیروؤں کے ہاتھوں میں تلوار دے کر اخلاق کے مقدس ترین ضابطے پامال کر ڈالے، اور اپنے ساتھیوں کو فسق و فجور اور لوٹ کھسوٹ کی اجازت دے دی، لڑائیوں میں قتل ہو جانے والوں سے وعدہ کیا کہ وہ جنت کی دائمی لذتوں سے لطف اندوز ہوں گے، چنانچہ کچھ ہی عرصہ میں ان کے متبعین نے ایشیائے کوچک، افریقہ اور اسپین کو اپنا شکار بنا لیا، ان کی وجہ سے اٹلی کو خطرہ درپیش ہوا، آدھا فرانس بھی ان لوگوں کے ہاتھوں برباد ہو گیا، اور تہذیب و تمدن پر سخت افتاد آئی۔۔۔۔ یہ عیسائیت تھی جس نے اسلام کی فاتحانہ پیش قدمی پر روک لگائی، اور تقریباً دو سو ۲۰۰ برس تک صلیبی جنگیں ہوتی رہیں جن کے نتیجہ میں یورپ میں اسلحے عام ہوئے، تب عیسائیت کو نجات ملی، اور صلیبی جھنڈے کے سامنے ہلالی پرچم سرنگوں ہوا، اور انجیل نے قرآن اور اس کے معمولی اور گھٹیا قوانین اخلاق پر فتح حاصل کی۔"

ایک اور مستشرق میو کیون اپنی کتاب میتھالوجی آف اسلام میں لکھتے ہیں:

"دین محمدیؐ، جذام کی بیماری کی طرح لوگوں میں پھیلا، اور اس نے ان کی دھجیاں بکھیر دیں، یہی نہیں، بلکہ وہ ایک خوفناک مرض اور ایسا پاگل پن ہے، جو انسان کو انتہائی کمزوری اور سستی پر آمادہ کرتا ہے، اور اگر بیدار بھی کرتا ہے، تو صرف خون ریزی، شراب خوری اور دوسری ساری برائیوں کے لئے، مکہ میں (۹) محمدؐ کی قبر بجلی کا ایسا ستون ہے جو مسلمانوں کے سروں میں جنونی کیفیت پیدا کر دیتا ہے، اور انہیں ہذیان، ہسٹیریا، عقل فراموشی

اور اللہ اللہ کے الفاظ کی رٹ لگانے پر مجبور کر دیتا ہے، اور جو چیزیں اصل فطرت کو مرغوب ہیں، ان سے نفرت کا خوگر بناتا ہے، مثلاً لحم خنزیر، شراب اور موسیقی وغیرہ، اور ان میں سنگدلی اور فسق و فجور کے جذبات و خیالات کی پرورش کرتا ہے۔"

مستشرق جویلیان اپنی کتاب تاریخ فرانس میں لکھتے ہیں:

"محمدؐ مسلمانوں کے مذہب کے بانی ہیں، انہوں نے اپنے متبعین کو حکم دیا کہ وہ دنیا کو زیر کریں، اور سارے مذاہب کو تبدیل کر کے اپنے مذہب کا بول بالا کریں، ان بت پرستوں (مسلمانوں) اور عیسائیوں میں کتنا بڑا فرق ہے، عربوں نے اپنے مذہب کو طاقت سے لوگوں پر مسلط کیا، اور لوگوں سے کہا کہ اسلام لاؤ، ورنہ موت کے لئے تیار ہو جاؤ، جبکہ مسیح کے ماننے والوں نے اپنی نیکی اور حسن سلوک سے لوگوں کو راحت بخشی، اگر یہ عرب ہم پر فتح یاب ہو جاتے، تو خدا جانے دنیا کی کیا حالت ہوتی، آج ہم بھی الجزائری اور مراکشی مسلمانوں جیسے ہوتے۔"

ڈاکٹر گلوور نے اپنی کتاب "تقدم التبشیر العالمی" (عالمی مشنریوں کی ترقی) میں، جو ۱۹۶۰ء میں نیویارک سے شائع ہوئی ہے، ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

"محمدؐ کی تلوار اور قرآن، یہ دونوں تہذیب، حریت اور حق کے سب سے بڑے دشمن ہیں، اور دنیا پر اب تک جو تباہی و بربادی منڈلا رہی ہے، اس کے سب سے بڑے باعث یہی ہیں۔۔۔ جس طرح قرآن، حقائق و خرافات اور قوانین اور دیومالائی تصورات کا عجیب و غریب مجموعہ ہے، اسی طرح تاریخی غلطیوں اور باطل خیالات کی بھی اس میں آمیزش ہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ نہایت پیچیدہ ہے، اس کی کسی خاص تفسیر کے بغیر اسے کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا، مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ ان کا معبود وہ اللہ ہے جو تنہا ہے، بے نیاز ہے، اس کا نہ کوئی باپ ہے اور نہ بیٹا، گویا اللہ ایسا ظالم و جابر بادشاہ ہے، جس کو اپنی مخلوق و رعایا سے کوئی تعلق نہیں، حالانکہ اسلام

ان دونوں کے ربط و تعلق کا ذکر کرتا ہے . . . . محمد (ص) ایک آمر مطلق تھے . ان کا خیال تھا کہ قوم پر بادشاہ کا تو یہ حق ہے کہ وہ اس کی مرضی پر چلے، مگر بادشاہ جو چاہے من مانی کرے، خود محمد (ص) کی فطرت میں بھی یہ بات داخل تھی، چنانچہ جو ان کی مرضی پر نہ چلتا وہ اسے قابل گردن زدنی سمجھتے تھے . ان کا عربی لشکر، تباہی و بربادی اور غلبہ و تسلط کا پیاسا تھا، جس کو اس کے پیغمبر نے ہدایت بھی یہی دی تھی کہ جو ان کی اتباع کو نامنظور کرے، اور ان کے راستے سے دور بھاگے، اسے قتل کر دیں "

مستشرق سفاری نے ۱۷۵۲ء میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تھا . ان کا خیال ہے کہ :

" محمد (ص) نے اقتدار الٰہی کا اسی لئے سہارا لیا، تاکہ لوگ اس عقیدہ کو (آسانی سے) قبول کر لیں پھر انہوں نے خود پر بحیثیت رسول اللہ کے ایمان لانے کا مطالبہ کیا، حالانکہ یہ اعتقاد محض ایک فریب تھا، جس کو عقلی ضرورت نے جنم دیا تھا . . . . . "

اسی کج بحثی اور یاوہ گوئی نے دراصل اسلام اور صلیبیت کے درمیان خلیج حائل کر دی، اور دونوں میں ایسی شدید کشمکش پیدا کر دی، جس کے نتیجہ میں صلیبی جنگوں کے تلخ و تند گھونٹ آج تک یورپ کے حلق سے نیچے نہیں اترے، اور نہ ہی وہ اس تلخی کو فراموش کر سکا ہے، نومسلم محمد اسد (سابق لیوپولڈ ویس) ایک تلخ تجربہ کی طرح یہ حقیقت بیان کر چکے ہیں، کہ اسلام سے متعلق، یورپ کو ورثہ میں جو حقادت کے جذبات ملے وہ غیر عقلی تعصب کی صورت میں ان کی علمی بحثوں میں ظاہر ہو رہے ہیں، اور تاریخ نے یورپ اور عالم اسلام کے درمیان صلیبی جنگوں کے زمانہ سے جو خلیج پیدا کی، اس پر کوئی پل نہیں بن سکا، اور وہ نہ صرف یہ کہ باقی ہے، بلکہ اسلام کی تحقیر و تذلیل یورپ کے طرز فکر کا بنیادی حصہ بن چکی ہے، درحقیقت یورپ کے اولین مستشرقین نے موجودہ دور میں عیسائی مشنریوں کا رنگ روپ اختیار کر لیا ہے، جن کی ریشہ دوانیاں عالم اسلام میں جاری ہیں، ان لوگوں نے اسلامی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کی ایسی مسخ اور بگڑی ہوئی تصویر

پیش کی ہے، کہ وہ یورپ کے عیسائیوں کو ایک بت پرست مذہب نظر آتا ہے، گو بعد میں علوم استشراق، مشنریوں کے اثر سے آزاد ہو گئے، اس لئے ان پر جانبداری اور غیر عقلی رویہ اختیار کرنے اور مذہبی حمیت اور تعصب سے کام لینے کا الزام بھی نہیں عائد کیا جا سکتا، تاہم مستشرقین کو اسلام دشمنی ورثہ میں ملی ہے، اور وہ ان کی گھٹی میں داخل ہے، اس کا سبب صرف صلیبی جنگیں ہی نہیں، خود اسلام ہے، جو ان کی نظر میں سب سے بڑا خطرہ ہے، جیسا کہ لارنس براؤن نے اپنی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ اسلام کے اندر جو وسعت اور لچک پائی جاتی ہے اور جو طاقت نیز حرکت و حرارت اور توانائی پوشیدہ ہے، اس کی وجہ سے وہ یورپ کے سامراج کی راہ میں تنہا دیوار اور رکاوٹ ہے، اسی قسم کے خیالات کا اظہار دی مسلم ورلڈ مطبوعہ ۱۹۳۰ء کے ایک مضمون میں کیا گیا ہے :

" مغرب کی دنیا پر خوف و دہشت کا طاری ہونا ضروری ہے، جس کے چند اسباب ہیں؛ اسلام کا جب سے مکہ میں ظہور ہوا، وہ عددی لحاظ سے کبھی کمزور نہیں رہا، بلکہ ہمیشہ بڑھتا اور پھیلتا رہا، اور اسلام صرف ایک مذہب ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے بنیادی ارکان میں جہاد بھی شامل ہے، ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا کہ کچھ لوگ اسلام میں داخل ہونے کے بعد دوبارہ عیسائی ہو گئے ہوں "

جرمن مستشرق بیکر نے صراحت کے ساتھ کہا کہ :

" عیسائیت کی اسلام دشمنی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسلام جب قرون وسطیٰ میں پھیلا تو وہ عیسائیت کے فروغ کی راہ میں ایک طاقتور پشتہ بن گیا، اور ان ملکوں پر بھی حاوی ہو گیا جو عیسائیت کے زیر نگیں تھے "

ایسے پُر از تعصب ماحول اور کلیسائی طرز فکر کے ہوتے ہوئے کس کو اسلام اور پیغمبر اسلام (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی اصل روح و حقیقت کو سمجھنے سے دلچسپی اور رغبت ہو سکتی تھی یورپ میں مذہبی اصلاح اور روشنی و بیداری

کے زمانہ میں دین کو سیاست سے جدا کر دیا گیا، یہاں تک کہ بیسویں صدی آگئی، لیکن اسلام اور خصوصاً سیرت نبوی (ص) کے بارہ میں عیسائیت کے طرز فکر میں شمہ برابر تبدیلی نہیں ہوئی، بلکہ اس تعصب پر مبنی طرز فکر کی تقویت کے لئے اسٹیج تیار ہوتے رہے، اور اسلامیات کے تجزیہ اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطالعہ کے لئے نسلوں کی نسلیں ان اسٹیجوں پر اپنی اداکاری کا مظاہرہ کرتی رہیں، اسی قسم کے لوگ مستشرقین کے نام سے مشہور ہیں، ان میں سے بعض تو خالص کلیسا کے آدمی تھے، جو پادریوں کے لباس میں ملبوس تھے، لیکن ان کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کو کلیسا سے کوئی سرکاری تعلق اور واسطہ نہیں تھا۔ ان سے یہ توقع ضرور تھی کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ان کے حملوں میں نرمی ہوگی، اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شخصیت اور کارناموں سے متعلق ان کا گذشتہ موقف اور نظریہ بدلا ہوا ہوگا، اور ایک حد تک ایسا ہوا بھی، چنانچہ لب و لہجہ اور سب و شتم میں کچھ شائستگی آگئی، لیکن طرز فکر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، سیرت نبوی (ص) سے ناواقفیت اور اس کے مباحث میں تعصب کی کارفرمائیاں بدستور جاری رہیں، بے سروپا تعلیل و تجزیہ کی مشقیں ہوتی رہیں، دانستہ غلط فہمیوں کی تکرار ہوتی رہی، یہاں تک کہ جو محض وہم و خیال اور تعصب اور تنگ نظری کی پیداوار تھا اور جس کی بنیاد مستند واقعات کے بجائے شاذ اور غیر مستند روایات پر تھی، وہ لوگوں کی نگاہ میں یقین، اعتماد اور اعتبار کے درجہ تک پہونچ گیا، طرز فکر، انداز بحث اور طریقۂ تحقیق میں مستشرقین نے جو بنیادی غلطیاں کی ہیں، ان میں سے کچھ کی ذیل میں نشاندہی کی جاتی ہے، اور اسی ضمن میں اس قبیل کی بعض اور غلطیوں کی جانب ہم اشارہ کریں گے،

پہلی بات تو یہ ہے کہ بعض اوقات مستشرقین ضعیف روایات کو لے کر انہی کی بنیاد پر اپنا فیصلہ صادر کر دیتے ہیں، اور انکی تقویت کے لئے شاذ و غریب حدیث کو پیش کرتے ہیں، اور اسے مشہور و مستند روایت پر ترجیح دیتے ہیں، خواہ وہ نقد و جرح کی کسوٹی پر کتنی ہی کھوٹی کیوں نہ ثابت ہو، یہ لوگ ایسا قصداً اس لئے کرتے ہیں کہ یہی وہ واحد حربہ ہے جس سے وہ شکوک و شبہات کو ہوا دیتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ سیرت نبوی (ص) کے لمعات اور کارناموں کو وہ عیسائی یا یہودی اصولوں کی دین سمجھتے ہیں، مستشرقین کی بڑی تعداد نصرانی اور مسیحی ہے، اس لئے وہ اسلام کے محاسن کا اصل سہرا عیسائیت کے سر باندھتے ہیں، اور جو مستشرق یہودی ہیں وہ اسرائیل کے قیام اور صیہونیت کے تسلط کے بعد خاص طور پر اس بات کی کوشش کرتے ہیں، کہ ہر عربی اور اسلامی چیز کا سرا یہودیت سے ملادیں. درحقیقت اس باب میں دونوں گروہ اپنے میلانات و خواہشات کے تابع ہیں، مثلاً برطانوی مستشرق منٹگمری واٹ کہتے ہیں کہ "اپنے گھر والوں کے ساتھ یا ان کے بغیر محمد (ص) کی غار حرا میں آمد و رفت، کوئی ناممکن بات نہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ موسم گرما میں شہر مکہ کی سخت گرمی کی وجہ سے جو لوگ طائف نہیں جا سکتے تھے، وہ غار حرا میں چلے جاتے رہے ہوں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ یہودی اور عیسائی خصوصاً راہبوں کے اثر کی وجہ سے وہاں گئے ہوں یا ہو سکتا ہے کہ خود محمد (ص) کے ذاتی تجربہ نے ان میں بقائے دوام اور حیات جاودانی کی آرزو، امنگ اور رغبت پیدا کی ہو، یہی مستشرق دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ "ناموس کا لفظ یونانی لفظ (Momos) سے مشتق ہے، جس کے معنی شریعت یا کتب مقدسہ کے ہیں، موسیٰ (ع) کے ذکر میں بھی یہ لفظ ملتا ہے، اور ورقہ بن نوفل نے جب محمد (ص) پر وحی کی کیفیت دیکھی تو اسی ناموس کے لفظ سے اس کو تعبیر کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد (ص) پر جو کچھ نازل ہوا وہ یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس کتابوں کے مشابہ و مماثل ہے، اگر محمد (ص) کو یہ وہم تھا کہ وہ ایک قوم کے بانی اور اس کے شارع ہیں، اور جیسا کہ ابتداء میں ہوتا ہے، محمد (ص) شروع میں طبعی طور سے متردد تھے، اس وقت ورقہ بن نوفل کی حوصلہ افزائی، محمد (ص) کی داخلی کیفیات کے لئے اہم چیز ثابت ہوئی، اسی لئے بعد کی اسلامی تعلیمات، ورقہ بن نوفل کے افکار سے بہت زیادہ متاثر نظر آتی ہیں"

اسلام پر پہلی نظر ڈالنے ہی سے یہ شبہ رفع ہو جاتا ہے، اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں اور عیسائیت میں کوئی مشابہت نہیں ہے، لیکن اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو دونوں کے بنیادی اختلافات بھی سامنے آجاتے ہیں، یہی حقیقت تھی جس نے ماضی میں مشنریوں کے مبلغوں کو بھڑکا دیا تھا، حال ہی

میں پن گوئن سیریز کی ایک کتاب میں ایک پادری مستشرق نے ایسے کئی موازنے کئے ہیں، جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام اصلاً مسیحیت کی مسخ شدہ یا نا پختہ صورت ہے، مشہور مستشرق کانٹ ویل اسمتھ نے بھی اسلام اور مسیحیت میں یکسانی اور مشابہت کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی ایک دوسرے سے نفرت اور دوری کی ایک وجہ یہ بھی ہے، کہ دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کے عقائد کو سمجھنے میں غلطی سے کام لیا ہے، ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کے عقیدہ کو بھی اسی صورت میں پیش کرنے اور ڈھالنے کی کوشش کی، جس صورت میں وہ خود اس عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے، لیکن بہت سے دوسرے خیالات کی طرح یہ رائے بھی منصفانہ نہیں ہے، کیونکہ تنہا عیسائی ہی صدیوں سے اسلام کو سمجھنے بلکہ غلط سمجھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، ان کی یہ کوشش، عیسائی اصطلاحات کے ذریعہ سے ہوتی رہی ہے، اس کا انجام ظاہر ہے کہ سوء فہمی اور بدعقیدگی کے علاوہ کیا ہو سکتا تھا، دوسری جانب مسلمانوں کا بنیادی زاویہ نگاہ ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہا، کیونکہ یہ نقطۂ نظر، قرآن کا عطا کردہ تھا، اسی لئے کسی مسلمان نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ وہ عیسائیت کو کسی اور فریم میں اتارے، لیکن ایک عیسائی اپنی مقدس کتابوں میں ایسی کوئی صراحت نہیں پاتا ہے جو اس کو اسلام کے بارہ میں ایک مسلمان کے اعتقاد و نقطۂ نظر کو قبول کرنے سے روک دے، اس کے باوجود وہ نہ صرف عیسائیت کے بارہ میں مسلمانوں کے اعتقاد کو رد کرتا ہے، بلکہ اسلام سے متعلق اس کی رائے کو بھی رد کرتا ہے، اور دونوں رایوں کو تبدیل کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھتا، یہ پرانے عیسائی مبلغ (کانٹ ویل اسمتھ) اپنے قارئین کی ذہانت کا شاید احترام بھی نہیں کرتے، چنانچہ اپنے ایک مقالہ کے مقدمہ میں علی الاعلان دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ اپنے معروضی اور خالص موضوعی مطالعہ کے بعد وہ صحیح معلومات پیش کر رہے ہیں تاکہ انہیں منصف اور محقق تسلیم کیا جائے، لیکن ان سب کے باوجود دوران بحث میں بڑے یقین کے ساتھ لکھتے ہیں کہ اب کسی طور پر بھی اس حقیقت میں شک کی گنجائش باقی نہیں رہی[۲۰] کہ محمدؐ نے نے یہودیوں کی کتاب تلمود اور دوسرے بعض تحریف شدہ صحیفوں کے افکار کو پیش کیا ہے، اور مسیحیت

کی نسبت و تعلق سے تو اس کا قوی احتمال ہے کہ محمدؐ کی وحی میں اس سے مدد لی گئی ہے، معروضی و موضوعی مطالعہ کا دعویٰ کرنے والے ان مستشرق کی یہ شاعرانہ خیال آرائی بھی لائق توجہ ہے، جو مقالہ کے آخر میں درج ہے، کہ دنیا والوں کو غور کرنا چاہئے کہ اس وقت کیا صورت پیش آئے گی جب لاکھوں مسلمانوں کے سامنے زندہ مسیح کی انجیل کو مناسب طور پر پیش کیا جائے گا۔

تیسری غلطی یہ ہے کہ یہ مستشرقین، اپنے مطالعہ میں معکوس طریقۂ منہج اختیار کرتے ہیں، اور نتائج کے استنباط میں بجائے عقل کے ذوق پر اعتماد کرتے ہیں، ڈاکٹر جواد علی نے لکھا ہے کہ اولین اکابر مستشرقین میں کیتانی اس طرز کے نمایاں نمائندہ تھے، اور آج تاریخ اسلام کے نئے ماہرین، انہی کے نقش قدم پر گامزن ہیں، یہ لوگ بنیادی طور پر ایک غلط فکر کو مدنظر رکھ کر اپنا مطالعہ شروع کرتے ہیں، پہلے سے رائے قائم کرتے ہیں، اور پھر واقعات میں ایسی چیزوں کو تلاش کرتے ہیں، جو ان کی رایوں کی کسی بھی درجہ میں تائید کرتی ہوں، باقی باتوں کو وہ خارج از بحث قرار دیتے ہیں، کیتانی ذی رائے اور صاحب فکر تھے انہوں نے سیرت نبویؐ کی تدوین سے پہلے ہی اس کے متعلق کچھ مخصوص خیالات قائم کر لئے تھے چنانچہ جب انہوں نے سیرت سازی شروع کی، تو . . . . رطب و یابس ہر قسم کی روایتوں پر اعتماد کر لیا، اور ان روایتوں کو خاص طور پر قبول کر لیا، جن سے ان کے موقف کی تائید ہوتی تھی، اور ان کے ضعف یا قبح کی کوئی پرواہ نہ کی، بلکہ انہیں دلیل بنا لیا، اور پھر انہی کے مطابق اپنا فیصلہ بھی صادر کر دیا، حالانکہ یقین ہے کہ وہ علمائے فن کے نزدیک وضعی اور جھوٹی روایات کے مشہور طرق و سلاسل سے واقف رہے ہوں گے، لیکن وہ علماء کے اقوال و آراء سے چشم پوشی کر گئے، وجہ ظاہر ہے کہ وہ صاحب فکر تھے انہیں اپنے خیال کو ثابت کرنا تھا، خواہ جس طریقہ سے بھی یہ ممکن ہو، اگر وہ جدید طرز و اسلوب کے مطابق نقد و جرح سے کام لیتے، اور غلط روایات کو رد کرتے، تو پھر "سیرت سازی" کا کارنامہ کیسے انجام دیتے، نو مسلم مستشرق ایتین ڈینیہ اپنی کتاب "الشرق کما یراہ الغرب" (مشرق، مغرب کی نظر میں) میں اس طرز و منہج کے

متعلق بعض باتیں خوب لکھ گئے ہیں، فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر اسنوک ہیر گورنج کی یہ رائے درست ہے کہ
"محمدؐ[29] کی جدید سیرت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر آپ کسی نظریہ یا کسی رائے کے متعلق تمسخر کا رویہ اختیار کرتے
ہیں، تو گویا تاریخی مباحث کے بانجھ اور بے جان ہونے کا اعلان کر رہے ہیں"، اس حقیقت کو موجودہ مستشرقین
کو بھی اپنے پیش نظر رکھنا بہتر ہوگا، کیونکہ اس سے انہیں ان پرانے امراض سے چھٹکارا ملے گا، جن کی وجہ سے
ان کو مقدور سے زیادہ محنت و زحمت کرنی پڑتی ہے، اور وہ بلاشک و شبہہ غلط نتائج تک جا پہنچتے ہیں،
اور لامحالہ انہیں اس کی ضرورت پیش آتی ہے، کہ وہ اپنے کسی خیال کی تائید کے لیے بعض روایتوں کو باطل
قرار[30] دے کر ان کی جگہ دوسری روایتوں گھڑ کر پیش کریں، اور یہ ظاہر ہے کہ بڑا مشکل کام ہے، بیسویں
صدی میں ایک عالم کے لئے صرف اسی صلاحیت کا ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کو زمانہ، ماحول، مقام، رسوم
اور ضروریات، رجحان اور میلانات جیسے بنیادی عوامل کی معرفت بھی ضروری ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر ان
باطنی عوامل کا شعور بھی لازمی ہے، جو عقل و قیاس کے پیمانوں سے پرے ہیں، اور جو افراد و جماعت میں بہر حال
اپنی تاثیر رکھتے ہیں، مانٹگمری واٹ نے فرانسیسی مستشرق لامانس پر اسی قسم کے الزامات عائد کئے ہیں،
جن کے مرتکب اکثر مستشرقین ہوئے ہیں، کہ وہ کج اسلوب ہیں، اور معکوس طریقہ اختیار کرتے ہیں، ان کا طرز
مطالعہ ہی غلط ہے، خاص طور پر تاریخی واقعات سے اپنی ذاتی رایوں کو یہ لوگ جس طرح مدلل کرتے ہیں، وہ
مطالعہ و تجزیہ کے نظام پر ایک بدنما داغ ہے، افسوس ہوتا ہے کہ لامانس جیسے مستشرق، دلائل کو اکثر و بیشتر غلط
رخ دے دیتے ہیں، ان کا یہ طریقہ قطعاً علمی نہیں ہے، معروضیت و موضوعیت کی پرواہ کئے بغیر وہ اپنے
خاص معتقدات و افکار کی تائید میں ایک خیال کو چھوڑ کر دوسرا خیال اپنا لیتے ہیں، مثلاً ایک عبارت میں
"الاحابیش وعبید اھل مکۃ" کا جملہ ہے، اس میں واؤ تفسیری ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ احابیش
عبید مکہ کے ضمن میں شامل ہیں، ایک اور عبارت میں ہے "الاحابیش ومن اطاعھم الی القریشیین
من قبائل کنانۃ وتھامۃ" یہاں پر واؤ تمیز کلم پر دلالت کر رہا ہے، لیکن لامانس نے اس عام نحوی قاعدہ

کے برخلاف، اس عبارت کی تشریح اپنے خیال کے مطابق کی، اپنی پسند اور مرضی کے مطابق تاریخی واقعات
کی تفسیر اور ان سے استنباط کی سینکڑوں مثالیں ان مستشرقین کی کتابوں میں موجود ہیں، مثلاً
بروکلمان نے غزوۂ احزاب کے سلسلہ میں کہیں اس کی جانب اشارہ بھی نہیں کیا کہ مدینہ پر عرب کے قبائل کو
حملہ کرنے کے لئے اکسانے میں یہود کا حصہ تھا، اور نہ یہ ذکر کیا کہ آزمائش اور امتحان کی سخت ترین گھڑی
میں بنو قریظہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے معاہدہ کو توڑ دیا تھا، بلکہ وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ
پھر مسلمانوں نے بنو قریظہ پر حملہ کر دیا، جن کا رویہ بہر حال خاموش و پوشیدہ تھا، مستشرق اسرائیل
ولفن سون نے غزوۂ خندق میں نعیم بن مسعود کے واقعہ سے چشم پوشی کر کے صرف یہ لکھا ہے کہ یہ واقعہ
مشرکین اور یہود کے درمیان عدم اعتماد کی وجہ سے پیش آیا، اس طرح وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہودیوں
کے لئے دھوکہ دینا ممکن ہی نہیں تھا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مستشرقین، اسلام دشمن عناصر پر بڑے مہربان ہوتے ہیں، خصوصاً یہودیوں
کے لئے وہ اپنے دل میں بڑا نرم گوشہ رکھتے ہیں، اسرائیل ولفن سون بنو نضیر کے یہود پر مسلمانوں کے
حملہ کے سلسلہ میں اس کی جانب تو اشارہ کرتے ہیں کہ مورخین عرب کے نزدیک مسلمانوں کے حملہ کی ایک بڑی
وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر قاتلانہ حملہ کی سازش کی تھی، لیکن وہ کہتے ہیں، کہ
مستشرقین اس روایت کی صحت کو قبول نہیں کرتے، ان کی دلیل یہ ہے کہ سورہ حشر میں جو بنو نضیر کی
جلاوطنی کے بعد نازل ہوئی تھی، کہیں اس سازش کا ذکر نہیں ہے، وہ جوش میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہر چشم
بینا رکھنے والا یہ سمجھ سکتا ہے، کہ بھلا ایسے حالات میں یہود کب یہ سازش کر سکتے تھے، اور اگر ان کو یہ
سازش کرنی بھی ہوتی، تو وہ بجائے اس کے کہ آپ (ص) پر دیوار سے بھاری پتھر پھینکتے، آپ (ص) کو اچانک
گھات دیکھ کر قتل کر دیتے۔ اسرائیل ولفنسون شاید یہودیوں کی نفسیات سے واقف نہیں، کہ یہ
وہ قوم ہے جو آخر وقت تک کسی بھی براہ راست تصادم سے بچتی رہتی ہے، بروکلمان لکھتے ہیں، کہ

مشرکین پر رسول اللہ (ص) کے باقاعدہ حملہ اور لشکر کشی کی راہ میں بعض دقتیں اور رکاوٹیں تھیں، قدیم عربی شرافت فکر مہاجرین کو اپنے قریشی بھائیوں سے جنگ کرنے سے روکتی تھی، مدینہ والے، اپنے طاقتور پڑوسیوں سے صلح و امن کی فضا کو غبار آلود کرنا نہیں چاہتے تھے ... آخر کار رجب کا مہینہ آیا تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خفیہ احکام کے ساتھ ایک فوجی دستہ کو روانہ کیا، جس نے ایک تجارتی قافلہ پر اچانک حملہ کیا، اور کافی مال غنیمت کے ساتھ مدینہ واپس ہوا ... اس قدیم ضابطۂ اخلاق کی قانون شکنی نے خود مدینہ میں نفرت کے جذبات بھڑکا دیئے تھے، مگر محمد (ص) نے اپنے پیروؤں کے عمل پر محض ہلکی سی نکیر کی اور کہا کہ ان لوگوں سے ان کا حکم سمجھنے میں سہو ہو گیا ہے، گو کہ ان لوگوں نے محمد (ص) ہی کی خواہش کے مطابق عمل کیا تھا، بروکلمان ایک جگہ لکھتے ہیں کہ محمد (صلعم) کا عہد ابھی زیادہ نہیں گذرا تھا کہ ان کے اور احبار یہود کے درمیان نزاع شروع ہو گئی، واقعہ یہ ہے کہ اس دور دراز علاقہ میں، اپنے محدود علم کے باوجود یہودی علماء، علم و ادراک میں نبی امی (ص) سے بڑھ کر تھے"۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ محمد (ص) کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اپنی فوج کی گرتی ہوئی ساکھ کو کسی دوسری صورت سے بحال کریں چنانچہ غزوۂ احد کی شکست کے بعد ایک معمولی سی بات پر انہوں نے بنو نضیر پر حملہ کر دیا، مستشرق ول ہاؤزن لکھتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے بعد اسلام اپنی رواداری کی پالیسی پر قائم نہیں رہ سکا، بلکہ اس نے مدینہ کے اندر رعب اور دہشت کی سیاست شروع کر دی، منافقین کے مسئلہ کو ابھارنا اسی تبدیلی کی علامت ہے، اور یہودیوں کو یہ ظاہر کیا گیا کہ وہ عہد شکن ہیں، چنانچہ چند ہی برسوں میں سارے یہودیوں کو یا تو جلاوطن کر دیا گیا، یا پھر ان کا خاتمہ کر دیا گیا، اور اس کے لئے چند لایعنی اسباب تلاش کر لئے گئے، مارگولیتھ نے یہودیوں سے اپنی محبت کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ خیبر کا سقوط، یہودیوں کے ساتھ سراسر ظلم تھا، جس کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں ... محمد (ص) نے ہجرت کے بعد، غارت گری اور لوٹ مار کا طریقہ اختیار کیا، مکہ والوں سے تو اس طرز عمل کی گنجائش یوں ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں نے محمد (ص) کو اپنے شہر سے نکالا تھا، ان کے مال و جائداد پر قبضہ کر لیا تھا، مدینہ کے یہودیوں کے سلسلہ میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان سے محمد (صلعم) کو انتقام

لینا تھا، لیکن خیبر والے تو مدینہ سے بہت دور تھے، وہ محمد (ص) یا ان کے متبعین کے حق میں کسی جرم و خطا اور ظلم و تعدی کے مرتکب نہیں ہوئے تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد (صلعم) کی سیاست میں کیسی عظیم تبدیلی آگئی تھی، مدینہ میں آنے کے بعد ہی انہوں نے یہ اعلان کیا کہ یہودیوں کے ساتھ ان کا معاملہ مسلمانوں کی طرح ہوگا، لیکن ہجرت کے چھٹے سال میں ان کا یہ موقف سراسر بدل چکا تھا، اور اب محض اتنی ہی بات کسی پر حملہ کرنے کے لئے کافی تھی، کہ وہ غیر مسلم ہے، اس سے محمد (ص) کی اس ہوس مال و جاہ کا اندازہ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے انہوں نے پے در پے حملے کئے، اسی ہوس میں پہلے سکندر اور بعد میں نپولین بھی سرشار تھا ... خیبر پر محمد (ص) کا قبضہ اس اندیشہ کا اعلان تھا کہ اسلام امن عالم کے لئے خطرہ بن گیا ہے، مستشرق نولدیکی کو یہ حسرت ہی رہی کہ کاش عرب قبائل نے محمد (ص) کے خلاف اپنے معابد اور دینی شعائر کے تحفظ کے لئے ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا ہوتا، تو ان کا جہاد کامیاب نہ ہوتا، افسوس، عرب متحد نہیں ہوئے، اور ان کے اختلاف و انتشار نے محمد (ص) کو یہ مہلت دی کہ وہ یکے بعد دیگرے ہر قبیلہ کو مطیع کرتے جائیں، اور ان پر کبھی طاقت و قوت کے ذریعہ اور کبھی دوستانہ معاہدوں اور پر امن ذرائع سے غلبہ حاصل کرتے رہیں۔

پانچویں بات یہ کہ ان مستشرقین نے سنت اور تاریخ کے عطایا اور ثمرات میں شکوک و شبہات پیدا کئے، اور اپنے ذوق و طبیعت اور مرضی سے ان کی نفی کی، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک میں بھی شکوک پیدا کئے، اور عجب کیا اگر ان کے امکان میں ہوتا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مبارک میں ہی شک پیدا کر دیتے، بہرحال سیرت رسول سے متعلق صحیح تاریخ کی نسبت وہ جو چاہیں کہیں، اس حقیقت سے وہ انکار نہیں کر سکتے کہ تمام انبیاء و رسل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سب سے زیادہ واضح اور مفصل ہے، ونسنگھم اس نقطہ پر اظہار خیال کرتے ہیں، کہ واقعی یہ افسوس کی بات ہے کہ بعض بڑے مستشرقین مثلاً میور، مارگولیتھ، نولدیکی، اسپرنگر، ڈوزی، کیتانی، لامنس، گولڈزیہر اور گارڈفرو وغیرہ نے نقد میں بعض اوقات نہایت غلو سے کام لیا ہے، اور ان کی

کتابوں میں خاص طور سے سیرت وکردار کشی کی گئی ہے۔ رنج کا مقام ہے کہ مستشرقین کا حاصل مطالعہ اور نتیجۂ فکر برابر سلبی رہا ہے۔ فادر لامانس ممتاز مستشرق ہیں، مگر تعصب میں بھی ممتاز ہیں، اپنی شاندار کتابوں کو انہوں نے اسلام اور نبی اسلام کی دشمنی سے داغدار کر دیا۔ ان عیسائی عالم کے نزدیک حدیث اگر قرآن کے موافق ہے تو گویا وہ قرآن سے منقول ہے۔ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب دو دلیلوں کی مطابقت کا اقتضا یہ ہو کہ انہیں رد کر دیا جائے۔ اور ان سے ایک دوسرے کی تائید و تقویت نہ ہو تو تاریخ کی تالیف کیونکر ممکن ہو گی؟ مستشرقین بڑی خوبصورتی سے سیرت کا اصل مصدر قرآن کو بتاتے ہیں، اور پھر سیرت کے ان واقعات کی تردید کرتے ہیں، جن کا ذکر قرآن میں نہیں۔ اس طرح صاحب قرآن کی سیرت کو مشکوک کر کے خود بخود قرآن کو بھی مشکوک بنا دیتے ہیں، گویا قرآن صرف ایک تاریخ کی کتاب ہے، جس کا خاص مقصد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مفصل سیرت کا استقصا ہے۔ اور قرآن کے علاوہ سیرت کی دوسری روایتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جو فضائل یا حالات بیان ہوئے ہیں، وہ ناقابل قبول ہیں۔ اسپرنگر کہتے ہیں کہ محمد (ص) کا نام قرآن کی چار سورتوں یعنی، آل عمران، احزاب، محمد اور فتح میں آیا ہے، اور یہ ساری سورتیں مدنی ہیں، اس سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں، کہ ہجرت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے محمد (ص) کے نام کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔ مدینہ میں انجیل کے اثر اور نصاریٰ سے ربط و ضبط کے بعد آپ (ص) نے اپنے لئے یہ علم بطور اسم علم اپنا لیا۔ کاش اسپرنگر سے کوئی یہ پوچھے کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نام کو انجیل کے مطالعہ کے بعد اپنایا، تو پھر وہ محمد کہاں ہیں جن کے بارے میں عہد نامہ قدیم و جدید میں بشارتیں موجود ہیں، سیرت سے متعلق شکوک و شبہات پیدا کرنے اور صحیح واقعات کی غیر منصفانہ نفی کے اس طرز ادا کے بارہ میں منٹگمری واٹ نے ایک اچھی بات کہی، حالانکہ وہ خود اپنے اس اصول پر ہمیشہ عمل پیرا نہیں رہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر واقعی ہماری خواہش یہ ہے کہ محمد (ص) سے متعلق ماضی میں جو غلطیاں ہوئی ہیں، ان کی اصلاح

اور تصحیح کریں تو ہمارے لئے یہ ضروری ہے، کہ ہم سیرت کے واقعات کو سچ جانیں، سوائے کسی ایسی روایت کے جس کے خلاف کوئی قطعی دلیل موجود ہو۔ یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ قطعی دلیل کی قبولیت کی شرط یہ ہے، کہ وہ زیادہ سے زیادہ درجہ امکان میں ہو، اور اس قسم کے موضوع میں اس کا حصول دشوار ہے۔

چھٹی بات یہ ہے کہ مستشرقین کی تحریروں میں لامذہبی، غیر معیاری اور غیر منطقی طرز استدلال نمایاں ہے، وہ سیرت کے زمانہ کو موجودہ زمانہ کے معیار کے مطابق جانچتے اور پرکھتے ہیں، اتین دینیہ اس قسم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے کہ مستشرقین اپنی تحریروں کو اپنے جذبات و رجحانات اور اپنے ماحول اور اس کے اثرات سے بالاتر رکھیں، اسی وجہ سے سیرت نبوی اور سیرت صحابہ (رض) میں انہوں نے انتہائی درجہ تحریف و ترمیم سے کام لے کر اس کی اصل حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے، وہ یہ دعویٰ تو ضرور کرتے ہیں، کہ ان کی تنقید کا اسلوب معروضی تعصب سے پاک، حقیقت پر مبنی اور سنجیدہ و علمی ہے، لیکن عالم یہ ہے، کہ اگر مؤلف جرمن مستشرق ہے تو محمد (ص) جرمن لہجہ میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں، اور اگر وہ اطالوی ہے، تو محمد (ص) کا طرز بھی اطالوی ہو جاتا ہے۔ اس طرح مصنف کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت بھی بدلتی رہتی ہے، اگر ان لوگوں کی تحریر کردہ کتب سیرت میں اس کی صحیح تصویر تلاش کی جائے، تو وہ بالکل ہی نظر نہ آئے گی، یہ مستشرقین صرف خیالی تصویریں پیش کرتے ہیں، جو حقیقت سے تمام تر دور ہوتی ہیں۔ والٹر اسکاٹ اور الیگزنڈر ڈیماس نے تاریخی افسانوں میں جن لوگوں کا ذکر کیا ہے، ان کی تصویر اس کے مقابلہ میں حقیقت سے کہیں زیادہ قریب ہے، لیکن ان مستشرقین نے افسانہ نگاروں کو بھی مات کر دیا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی سیرت نگاری وہ محض اپنی مغربی منطق اور موجودہ تصورات کے مطابق کرتے ہیں، ان کی کتابوں میں جرمن محمد، انگریز محمد، اور فرانسیسی محمد ضرور ملتے ہیں، لیکن محمد عربی (ص) کا پتہ کہیں نہیں چلتا، یہ

اور بات ہے کہ حق کے جویا، محمد (ص) کی روشن اور واضح سیرت کو پا ہی لیتے ہیں، اس لامذہبی اور محدود و مقامی
طرز استدلال نے اکثر مستشرقین کو دوسری غلطیوں کا مرتکب بنا دیا ہے، اس کی نمایاں مثال وہ ہے، جیسے
فلہاوزن اور ان کے چند رفقاء نے بیان کیا ہے تحریک اسلامی مکہ میں محدود تھی، اور شروع میں مدینہ میں بھی
اس کی یہی کیفیت رہی، مگر جب وہاں حالات سازگار ہوئے تو وہ عالمی مرحلہ میں داخل ہوئی، جس کے
بارہ میں اس سے پہلے محمد (ص) نے سوچا بھی نہیں ہوگا، اسی طرح یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ (ص) کی دور میں عدم تشدد
کے قائل تھے، لیکن مدینہ میں جب انہیں قوت واقتدار حاصل ہوا، اور ان کے ارد گرد جنگ جو اور لڑائی کرنے
والے اکٹھا ہوگئے، تو وہ طاقت اور تشدد کے اصول پر عمل پیرا ہوگئے، فلہاوزن کا خیال ہے کہ محمد (ص) کے حلقہ
بگوشوں میں چونکہ وہ لوگ بھی تھے جن کا ان سے خونی رشتہ نہ تھا، اور ان کا عقیدہ چونکہ خونی رشتے سے بڑھ کر تھا، اس
لئے وہ چاہتے تو تعصب اور تنگ نظری کے اس دائرہ کو ختم کر دیتے، جو خونی رشتہ کا نتیجہ تھا، لیکن وہ خونی رشتہ و
دائرہ سے ہٹ کر ایک وسیع دینی رشتہ و دائرہ کا تصور نہیں کر سکے، مستشرقین کے اس واہیات نظریہ کی خود
سر ٹامس آرنلڈ نے تردید کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ تعجب ہے، قرآن کی آیات بینات کے ہوتے ہوئے ہمارے
کچھ مؤرخین نے کیسے یہ دعویٰ کر دیا کہ ابتداءً بانی اسلام نے اسلام کو عالمی دین کی حیثیت سے پیش نہیں کیا تھا،
ان غلط کار مؤرخین میں سر ولیم میور بھی ہیں، جو رسالت محمدی کی آفاقیت کو بعد کی بات بتاتے ہیں، بہت سی
آیات و احادیث کے باوجود محمد (صلعم) کو اس کا خیال نہیں ہوا، اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے، کہ انہیں اسکا خیال
ہوا تھا، تب بھی یہ بہت مخفی اور پوشیدہ رہا، اور جو عالم ان کے پیش نظر تھا، وہ صرف عرب تھا، کیونکہ یہ دین صرف
اسی کے لئے ہی تھا، اور محمد (ص) نے اپنی بعثت سے وفات کے وقت تک بجز عربوں کے کسی اور کو اسلام کی دعوت نہیں
دی، گو اسلام کی عالمیت کا بیج بو دیا گیا تھا، لیکن اس کی نشوونما اور اس کے برگ و بار لانے میں منصوبوں اور
پروگراموں سے زیادہ حالات و واقعات کو دخل ہے؛ آرنلڈ نے اس خیال کو باطل قرار دیتے ہوئے لکھا ہے
کہ اسلام کا پیغام صرف عرب تک محدود نہیں رہا، بلکہ اس کا فیضان ساری دنیا کے لئے عام تھا، جس طرح آپ

کے نزدیک صرف ایک ہی معبود ہے، اسی طرح دین بھی ایک ہی ہے، جس کی جانب ساری انسانیت کو
دعوت دی گئی، اس بحث میں آرنلڈ کی ہمنوائی میں گولڈ زیہر، نولڈیکی اور سنخاؤ بھی شامل ہیں جن کا
خیال ہے کہ اسلام کا پیغام محض سرزمین عرب تک محدود نہیں تھا، بلکہ خدا کا یہ دین تمام مخلوقات
کے لئے ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ ساری انسانیت اس کے سامنے سرنگوں ہو جائے، اور محمد (ص) چونکہ اللہ
کے رسول تھے، اس لئے ان پر لازم تھا کہ وہ مطالبہ کرتے اور لوگوں کو خدا کی اطاعت قبول کرنے کی
دعوت دیتے، اور یہ اعلان، اسلام کے آغاز سے ہی کر دیا گیا تھا، آرنلڈ نے فلہاوزن اور میور وغیرہ کے
اس نظریہ کی بھی تردید کی ہے، کہ محمد (ص) نے حالات کے تحت قوت و طاقت کا استعمال کیا ہے، مگر وہ یہ
لکھ کر خود بھی غلطی کر گئے ہیں، کہ محمد (ص) کی خواہش اور ایک اندرونی جذبہ نے، انہیں ایک نئے دین کی تشکیل
کے لئے آمادہ کیا تھا، اور وہ اس راہ میں کامیاب ہوئے، لیکن اسی کے ساتھ ہی انہوں نے نئے طرز پر ایک
جداگانہ سیاسی نظام کی بنیاد بھی رکھی، حالانکہ ابتداءً ان کی یہی خواہش اور کوشش رہی کہ وہ اپنے ہم وطنوں
کو خدا کی وحدانیت کی دعوت دیں

حقیقت یہ ہے کہ سیرت نبوی کے فہم و مطالعہ کے لئے ایسی گہری نظر درکار ہے، جو اسلام کی تحریک
کا اس حیثیت سے جائزہ لے کہ وہ خدا کے علم میں ایک مکمل پروگرام کی شکل میں تھی، جس کا ارتقاء تدریجاً ہوا، اور
یہ قرآن میں بھی متعین صورت میں تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت اس پروگرام کو بہترین ڈھنگ
سے اپنی بے نظیر صلاحیتوں، اعلیٰ اخلاق اور انتہائی ذہانت کے ساتھ نافذ کرنے والے کی تھی، قرآن گو حالات
و واقعات کی رعایت سے نجماً نجماً نازل ہوا ہے، لیکن یہ اس کے متعین خدائی پروگرام ہونے کے منافی
نہیں ہے، در اصل وہ ایک بہترین نظام حیات ہے، جس میں جزئیات و کلیات آپس میں ایک دوسرے
سے مربوط ہیں، یہ حالات و واقعات ایسے وقتی اور قطعی نہیں تھے، جو اسلام کی رفتار ترقی کو محدود کر دیتے،
وہ ایک ہدف اور مقصد تھا جو کبھی بھی حالات و عادات زمانہ کے لئے روک، چیلنج اور ہمہ گیر انقلاب بن جاتا

تھا، اس کا پوری طرح اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ اوّل قدم ہی پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے جاہلیت کے رخ پر لا الہ الا اللہ کا نقاب ڈال دیا تھا، اس وقت وہ کون سے وقتی حالات یا مقامی تقاضے
تھے جس نے اس انقلابی نشان کی جانب آپ کی رہنمائی کی تھی، جس نے جاہلیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا
تھا، اور اس کی یادگاریں، رسم و رواج، نشانات و علامات اور معانی و مفاہیم سب کو تہہ و بالا کر ڈالا تھا،
آرنلڈ نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے، کہ اسلام کا اس شان سے ظہور بالکل نہیں کھٹکتا، کیونکہ وہ
بت پرست عربوں میں ایک نئی تحریک تھی، وہ مختلف معاشروں میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کا یہ کتنا زبردست
تعارض تھا، اسلام، عرب معاشرہ میں محض اس لئے نہیں داخل ہوا کہ وہ چند ظالمانہ و وحشیانہ رسوم
کا خاتمہ کر دے، بلکہ وہ ایک مکمل انقلاب تھا، جس نے اپنے سے قبل کی زندگی کو یکسر بدل دیا تھا، واقعہ
یہ ہے کہ محمد (ص) کی دعوت میں چند ایسی بنیادی باتیں تھیں، جو عام عربوں کے اس نقطۂ نظر سے قطعاً مختلف
تھیں، جن کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے، ان کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی کہ وہ نومسلم جن کو یہ اسلام سے
پہلے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، اب فضائل میں وہ ان سے آگے ہیں، قرآن ایک اعلیٰ کتاب تھی،
جس کی آیتیں ہر دور میں اور ہر زمان و مکان میں انسانیت کی رہنمائی کے لئے نازل ہوئی ہیں، وہ
سلبی اور ایجابی کسی پہلو سے بھی کسی خاص زمانہ اور مخصوص فضا کے زیر اثر نہ تھا، جیسا کہ اکثر مستشرقین
عیسائیوں اور کمیونسٹوں کا خیال ہے، اہل مغرب سے ہم یہ مطالبہ نہیں کرتے ہیں کہ وہ قرآن پر بحیثیت
آسمانی کتاب کے ایمان لائیں، اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اللہ کا رسول تسلیم کریں، بلکہ ہمارا مطالبہ
صرف یہ ہے کہ وہ غیر جانبدار ہو کر معروضیت اختیار کریں، اور سیرت نبوی کا اسی حیثیت سے مطالعہ
کریں، اور قرآن کریم کو ایک مثالی و نظریاتی کتاب سمجھیں، جس کی تعلیمات، زمان و مکان اور وقتی حالات
سے ماوراء ہیں، اس میں اگرچہ وقتی حالات کا ذکر بھی ہے، تو یہ گوناگوں پاکیزہ قدروں اور اصولوں کا
سرچشمہ ہیں، جن سے مستشرقین کو غافل نہیں رہنا چاہئے،

یہ صحیح ہے کہ مستشرقین کا ایک طبقہ بھی ہے، جس نے اپنی دقت نظر سے سیرت نبوی سے متعلق ہماری
تاریخ اسلام کے بعض نازک، دقیق اور پوشیدہ گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے، لیکن اس غلط منہج اور طرز فکر
کی وجہ سے جس کی کچھ مثالیں ہم پیش کر چکے ہیں، اس نے اصل موضوع کے اندر بہت سے غلط نتائج و ثمرات
بھی شامل کر دیئے ہیں، اور یہ ایک فطری امر بھی ہے، کہ خطا سے خطا ہی سرزد ہوتی ہے، اور موضوعیت سے
تعدد و انحراف کے بعد ایسے ہی نتائج برآمد ہوں گے، جو علم کی روح اور سنجیدگی سے خالی ہوں گے۔

اس مختصر مضمون میں کسی تفصیلی بحث و مطالعہ اور تجزیہ و محاکمہ کی گنجائش نہیں، غور و فکر سے کام
لینے والوں کو خود ہی پتہ چل جاتا ہے، کہ مستشرقین نے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق جو کچھ لکھا ہے
اس کی تہوں کے اندر ہر قسم کا تضاد اور فکری اضطراب لپٹا ہوا ہے، اور جس کا علمی بحث اور سنجیدہ اسلوب
سے کوئی تعلق نہیں، لیکن یہ کلیہ استثناء سے خالی نہیں ہے، اور چند ایسے مستشرقین بھی ہیں جنہوں نے
خود بھی سنجیدہ طرز فکر کو اپنایا، اور بعض ہم قلم مستشرقین کی غلطیوں کو بھی واضح کیا، ڈبلیو واٹ، درمنگھم اور
آرنلڈ کے بعض خیالات ہم گذشتہ صفحات میں پیش کر چکے ہیں، گو ان مستشرقین کا نقطۂ نظر بھی زیادہ علمی
اور پاکیزہ و شفاف نہیں ہے، مگر اس سے زیادہ کی توقع کرنا بھی محال اور دشوار ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز اور روس میں بالشویکی انقلاب کی کامیابی کے ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اور تاریخ اسلام کے متعلق ایک نیا موقف سامنے آیا، جو تاریخ کی مادی تعبیر کا نتیجہ تھا، اس کی یہ کوشش رہی
کہ اپنے دستور و منہج کے مطابق جارحانہ انداز سے سیرت نبوی میں قطع و برید کر کے اس کی دھجیاں بکھیر دی جائیں
تاکہ لوگوں کا اس سے تعلق ہی ختم ہو جائے، ان لوگوں کو جو کچھ اپنے موافق نظر آیا، اسے تو لے لیا اور باقی کو نظر
انداز کر دیا، اس طرح جو کچھ لیا اس کا تناسب نہ لئے گئے کے مقابلہ میں ایک اور دس کا ہے۔ چونکہ سیرت
کے واقعات ان کی تحلیل و تجزیہ اور مخفی اغراض و خواہشات کے سراسر خلاف تھے، اس لئے انھوں نے
تفسیر و تاویل اور قطع و برید میں بڑے عناد اور انتہائی زیادتی سے کام لیا، نیز فلسفہ اور واقعات کے درمیان

مطابقت کی تلاش وتحقیق اور تعلیل وتوجیہ میں بھی ان لوگوں نے بڑی جانبداری کا ثبوت دیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ہی واقعہ کے بارہ میں ان کی رائیں مختلف ومتضاد ہو گئیں، حالانکہ وہ ایک ہی مکتبِ فکر کے خوشہ چیں، اور ایک ہی دبستان سے تعلق رکھتے تھے، مثلاً بعض مارکسی مستشرقین کا خیال ہے، کہ مکہ ومدینہ میں عرب معاشرہ نے پہلی بار ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کا مشاہدہ کیا جس میں غلاموں کو بھی حقِ ملکیت دیا گیا تھا، ہیولفسکایا کا خیال ہے کہ قرآن نے غلام کے حقِ ملکیت کے مرحلہ کے دور ہونے کو تسلیم کیا ہے، توبلانیف کے اس خیال سے متفق ہیں کہ کمزور طبقہ کا یہ دور اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ عرب، دوسری قوموں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں تھے، دوسرے مارکسی مستشرقین کہتے ہیں کہ کمزور طبقہ کا معاشرہ فعلاً وجود میں آ گیا تھا، کلیمو فیچ کا خیال ہے کہ اسلام، جائداد سے نفع اندوز طبقات کے مفاد کی رعایت رکھتا ہے، اور کمزور طبقہ کی سرمایہ داری کا حامی ہے، بعض کا قول ہے کہ اسلام صرف غریب طبقہ کی سرمایہ داری کا محافظ ہے، بلانیف کی رائے ہے کہ اسلام جس کا نمائندہ قرآن ہے اور برسرِ اقتدار طبقوں کے معاشرتی اور سیاسی مفاد کا لحاظ نہیں رکھتا، اسی لئے مسلمان جدید طبقوں کے استحصال کو جائز کرنے کے لئے حدیثیں گڑھنے پر مجبور ہوئے، بعض کہتے ہیں کہ یہ اسلامی سرمایہ داری تھی جس نے مقصد برآری کے لئے عربی قبائل کو وحدت کی لڑی میں پرو دیا تھا، لیکن دوسرے مارکسی مستشرقین کی رائے یہ ہے کہ قبائل وحدت کی طرف اچھل کود کر رہے تھے کہ اسلام کا آغاز ہوا، جس کی وجہ سے وحدت عمل میں آئی، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں یہ آپس میں تضادِ رائے کے شکار ہیں، کلیمو فیچ کہتے ہیں کہ اور نبیوں کی طرح محمد (ص) بھی ایک نبی تھے، آپ نے توحید کی بشارت دی اور قبائل کو متحد کرنا چاہا، لیکن تولسٹوف، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کے ہی منکر ہیں، اور آپ (ص) کی شخصیت کو محض ایک افسانوی شخصیت سمجھتے ہیں، بعض لوگ ظہورِ اسلام کے معترف ہیں، لیکن کلیمو فیچ کا خیال ہے کہ

اسلام کا ایک بڑا حصہ، بعد میں کمزوروں کے مفادات کے تحفظ کی شکل میں سامنے آیا، جس کا تعلق محمد (ص) کی حیرتناک کارکردگی سے ہے، ٹولسٹوف اس حد تک بڑھ گئے کہ ان کے خیال میں اسلام ایک من گھڑت افسانہ ہے، جو خلافت کے دور میں برسرِ اقتدار طبقہ کے مفاد کی خاطر گڑھا گیا، اور اس کے وضع واختراع میں ان پرانے اعتقادات سے استفادہ کیا گیا ہے، جن کو منقبت کہا جاتا تھا۔

ان چند مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مارکسیت ایک ایسا جدید مذہب ہے، جو اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض ونفرت میں عیسائیت سے کسی طرح کم نہیں ہے، موضوعی ومعروضی مطالعہ سے انہیں بھی کوئی واسطہ نہیں، در اصل رسول اللہ (ص) اور تاریخِ اسلام کی حد تک یہ مارکسی جدید دور کے پادری ہیں جنہوں نے اپنے بھیس ضرور بدل لئے ہیں، لیکن اپنے اندرون میں وہ وہی قدیم عیسائی پادری ہیں، جو اپنے کو جدید مادیت سے منسوب کرتے ہیں، ان لوگوں نے سیرتِ محمدی (ص) کو اس سے کم دھندلا نہیں کیا ہے، جتنا قدیم نصاریٰ نے کیا تھا، ذیل میں مادی کلیسا کے ایک فرزند بندلی جوزی کے بعض خیالات پیش کئے جاتے ہیں؛ وہ لکھتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ نبی کریم (ص) کی جو سیاست تھی وہ نئے عوامل کے زیرِ اثر اور بعض دوسرے اسباب کی بنیاد پر جو حالات اور تجربات کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے، مدینہ میں بڑی حد تک بدل گئی تھی، مکہ سے وطنِ اصلی ہونے کے تعلق اور وہاں کے لوگوں سے قرابت اور غزوۂ بدر واحد وخندق کے بعد پیش آنے والے جذبات اور سیاسی عوامل کی وجہ سے آپ نے اپنے مکی بھائیوں کے ساتھ نرمی ومہربانی کی سیاست اختیار کی، خود مکہ کے برسرِ اقتدار طبقہ نے بھی بدر کی شکست اور اس میں لاحق ہونے والے مالی نقصان کے بعد یہی مناسب سمجھا کہ چند شرطوں کے ساتھ آپ سے صلح کر لی جائے، جو یہ تھیں، کہ کعبہ حج اور عکاظ کو اسی حال میں باقی رکھا جائے، جیسے وہ اسلام سے پہلے تھے، اور ان کے ساتھ عفو ودرگذر کا معاملہ کیا جائے، نیز آپ (ص) ان کو بھی اپنے اس نئے عمل میں شریک کریں، جس میں انہیں اپنے لئے خیر اور بہتری کی توقع ہو، ان کی یہ بھی شرط تھی کہ آپ (ص) مدینہ ہی میں رہیں گے اور مکہ والوں کے مالی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے، چنانچہ صلح حدیبیہ ہوئی اور تالیفِ قلوب کی

سیاست اختیار کی گئی، جسے دوسرے لفظوں میں رواداری اور مصالحت کی سیاست بھی کہہ سکتے ہیں، اسکے نتیجہ میں لوگ خدا کے دین میں جوق در جوق شامل ہوگئے، مگر یہ لوگ اسلام کو صحیح دین سمجھ کر اس میں نہیں شامل ہوئے تھے بلکہ وہ اس لیے اسلام میں داخل ہوئے تھے کہ نئے حکمراں طبقہ کا قرب حاصل کر سکیں، اور اپنے قدیم مذہبی مرکزوں اور دولت کا تحفظ کر سکیں، بندلی جوزی کے خیال میں حدیبیہ یا کسی اور موقع کی ایک شرط یہ بھی تھی جس کے دونوں فریق متفق تھے کہ نبی کریم (ص) مکہ کے سربرآوردہ لوگوں کو طعن وتشنیع کرنے سے باز رہیں گے، اور وہاں کے غریبوں اور کمزوروں کو ان کے خلاف جنگ پر آمادہ نہیں کریں گے، میرے خیال میں اسی بنا پر مدنی بالخصوص آخر دور کی سورتوں میں مکہ کے باشندوں کے بارے میں کوئی سخت آیت نازل نہیں ہوئی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی مدینہ میں آکر بدل گئی، اور اسی وجہ سے نبی کی بعض اجتماعی اور دینی اصلاحات ناقص رہیں، اور جیسا کہ اہل یورپ کہتے ہیں، اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قدر تساہل کو بھی دخل تھا"۔۔۔

یہ بالکل بے سروپا بات ہے، صلح حدیبیہ کی تمام شرطیں معروف ومشہور ہیں، نہ ان میں اسکا کہیں ذکر ہے، اور نہ کسی اور مقام اور زمانہ میں آپ نے اس طرح کی شرط عائد کی تھی، بندلی جوزی یہ بھی لکھتے ہیں، کہ "نبی کریم (ص) کا مکی دور تمہید و تیاری کا دور تھا، جس میں مختلف طبقوں میں ایک نئی دعوت کو پھیلانے کی کوشش جاری تھی، اس دور میں ایک شخص جو اپنے اصولوں پر ثابت قدم اور اپنے عمل میں مخلص تھا، اس کے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان الفاظ کی جنگ جاری تھی، جو اپنی قیادت اور دولت کے بارہ میں خطرات محسوس کر رہے تھے، چنانچہ اس شخص کے خلاف مقابلہ وصف آرائی ہوتی رہی، یہ دور کوششوں اور تمناؤں کا دور تھا، اگر یہ کوششیں بارآور ہو جاتیں تو پورا ملک یکسر بدل جاتا، یہ دور کتنا اچھا اور عمدہ تھا نبی (ص) کا دوسرا دور عمل تنظیم، جنگوں اور سیاست کا دور تھا، لیکن اس میں طرفین کی جانب سے تساہل برتا گیا، اس طرح کے موقع پر تساہل کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بعض اصول ترک کر دیئے جائیں اور بعض مطالبوں سے دستبرداری اختیار کر لی جائے، یا بعض افکار وخیالات سے رجوع کر لیا جائے، یا انہیں اس انداز سے پیش کیا

جائے، جس سے دونوں فریق خوش اور مطمئن رہیں۔ اسی نوعیت کا معاملہ نبی (ص) اور صدر جمہوریہ مکہ ابوسفیان کے درمیان پیش آیا تھا، ابوسفیان نے نبی (ص) کی روحانی وسیاسی قیادت، بتوں کی ہجو، نماز اور زکوٰۃ کی ادائی منظور کر لی تھی، اور نبی (ص) نے یہ منظور کر لیا تھا کہ مکہ کی روحانی اور دینی مرکزیت برقرار رہے گی، مکہ کے اعیان وعمائد کو نئی روحانی جمہوریت میں انتظام وانصرام کا حق ملے گا، اور ان کو ان کے حسب مرضی زندگی گذارنے کی مکمل آزادی حاصل ہوگی، اس معاہدہ میں غریبوں اور کمزوروں کا تیسرا گروپ سب سے زیادہ خسارہ میں رہا، حالانکہ اسی طبقہ کی خاطر جنگیں ہوئیں، اور اسی کی حالت درست کرنے اور بہتر بنانے کے لئے دعوت نبوی ﷺ کا ظہور ہوا تھا، لیکن ابتدا میں ان لوگوں کو صرف کچھ صدقات وزکوٰۃ دے کر خوش کر دیا گیا، اور نبی (ص) اور ان کے خلفاء کے دور کے بعد اس طبقہ کو قصداً یا بلا قصد وارادہ فراموش کر دیا گیا، چنانچہ یہ جیسا تھا ویسا ہی رہا، بلکہ پہلے سے بھی زبوں تر ہو گیا،"

یہی مستشرق ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "بلاشبہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے اقوال و افعال کے ذریعہ مکہ و مدینہ میں، معاشرہ کے شر کے اسباب اور اس کے جراثیم کو ختم کرنے کی اسطرح کوشش نہیں کی، جس طرح کی کوشش آج کل کمیونسٹ کر رہے ہیں، اگر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چاہتے، تو جزیرۃ العرب میں صاحب اقتدار واختیار رہنے کے بعد اجتماعی امراض کے جراثیم ختم کر دیتے، اور وہ غریبوں اور کمزوروں اور غلاموں کے استحصال کو روک دیتے، اس حیثیت سے نبی (ص) اپنے پیشتر کے دوسرے انبیاء ہی کی طرح تھے، ان سب نے ادبی وسائل کے استعمال کو فوقیت دی، اور اس طریقہ کو نہیں اپنایا جسکو یورپ کے مصلحین اور سیاست دانوں، مثلاً لینن اور مسولینی نے اختیار کیا، اس بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمد (ص) نے عرب کے معاشرتی واجتماعی امراض کی تشخیص تو کی، لیکن انہوں نے نہ علاج کیا، اور نہ ان کے جراثیم کا استیصال کیا۔

استحسان

تشریعِ اسلامی کا ایک اصول[1]

از جناب مولوی نسیم اللہ اعظمی صاحب ، المعہد العالی مرقات العلوم ، مئو

تغیر پذیر دنیا میں ایسے واقعات کا پیش آنا ممکن ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہیں، جن کا حکم کتاب وسنت اور اجماعِ امت سے صراحۃً معلوم نہ ہو سکے، متحرک زندگی میں ہر آن نت نئے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، جن کے بارے میں شریعت مطہرہ کا حکم دریافت کرنا عملی میدان میں قدم رکھنے سے پہلے ہر مسلمان کی ایک اہم ضرورت ہے، اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے کتاب وسنت میں ایسے اصول ومبادی فراہم کئے گئے ہیں، جن پر قیاس واستنباط کر کے قیامت تک پیش آنے والے واقعات کے احکام معلوم کئے جا سکیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید دین کے مکمل ہونے کا اعلان محل نظر ہوتا، کیا جو دین لامحدود واقعات کے احکام بتانے سے خاموش ہو، وہ مکمل کہلانے کا مستحق ہوتا؟

عملی زندگی میں جب کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہے جس کا حکم ناطق کتاب وسنت میں نہیں ہوتا تو مجتہد اس واقعہ کو کسی ایسے منصوص واقعہ کے مساوی ٹھہراتا ہے، جو علت ومصلحت میں اس واقعہ کے مساوی ہوتا ہے، علت میں مساوات کی وجہ سے غیر منصوص پر منصوص کا حکم لگا دینا قیاس کہلاتا ہے۔

---

[1] مضمون کی تیاری میں فضیلۃ الشیخ عبد الوہاب خلاف کی دو تصنیفیں "مصادر التشریع الاسلامی" اور "علم اصول الفقہ" خاص طور پر مدنظر رہی ہیں، مثالیں زیادہ تر "ہدایہ" سے لی گئی ہیں۔

اجتہاد بالرائے میں مجتہد کا سب سے اہم کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اُن مصالح وعلل کو حتی الوسع صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کرے جن پر منصوص حکم کی بنیاد رکھی گئی ہے، اس حکم کے پیچھے شارعؑ نے کن مصالح کی رعایت رکھی ہے؟ وہ ظاہری علت کیا ہے جس کے ساتھ شارع حکیم نے حکم کو مربوط کیا ہے؟ واضح طور پر مجتہد کے ذہن میں اگر ان سوالوں کا جواب مہیّا ہو جائے تو گویا اس نے علت کا ادراک کر لیا، اسی کو تخریج مناط کہتے ہیں، اب اس سے آگے بڑھ کر اس مخصوص واقعہ میں غور وفکر کرتا ہے جس کا حکم معلوم کرنا اس کا مقصود ہے، اگر اس واقعہ میں وہی علت موجود ہے جو منصوص حکم میں پائی جاتی ہے تو وہ اس واقعہ پر بھی وہی منصوص حکم چسپاں کر دیتا ہے جزوی واقعات میں علت کا پتہ لگانا تحقیق مناط کہلاتا ہے۔

لیکن بعض واقعات ایسے ظروف واحوال سے گھرے ہوتے ہیں جن سے صرفِ نظر کر کے نفسِ واقعہ پر قیاسِ ظاہر یا حکم کلی جاری کرنا مصلحتِ عامّہ کے فوت ہونے یا کسی مفسدہ تک پہونچانے یا حرج کا باعث ہوتا ہے۔ اس وقت مجتہد مصلحتِ عامہ کی رعایت رکھتے ہوئے مخصوص ظروف واحوال میں گھرے ہوئے واقعہ کو حکم کلی سے مستثنیٰ کر دیتا ہے۔ یا اس پر ظاہری قیاس جاری کرنے کے بجائے خفی قیاس جاری کرتا ہے، جو اول الذکر سے زیادہ قوی الاثر ہوتا ہے۔

استحسان کی تعریف استحسان کے معنی کسی شئی کو اچھا جاننا یا کسی رائے کو عمدہ سمجھنا ہے، علمائے اصول نے اس کی اصطلاحی تعریف مختلف الفاظ سے کی ہے، علمائے احناف میں ابو الحسن کرخی نے استحسان کی تعریف مندرجۂ ذیل لفظوں میں کی ہے۔

الاستحسان هو ان يعدل الانسان	استحسان یہ ہے کہ مجتہد اس حکم کے خلاف
عن ان يحكم في المسئلة بمثل ما	فیصلہ صادر کرے جو مسئلہ کے نظائر میں
حكم به في نظائرها الى خلافه	صادر کیا تھا اور ایسا کسی ایسے سبب سے
لوجه يقتضي العدول عن الاول۔	کرتا ہے جو پہلے حکم سے عدول کا مقتضی ہو۔

علماء مالکیہ میں ابن رشد نے یہ تعریف کی ہے۔

الاستحسان هو طرح القیاس الذی یؤدی الی غلو فی الحکم ومبالغة فیه الی حکم آخر فی موضع یقتضی أن یستثنی من ذالک القیاس۔

استحسان یہ ہے کہ جو قیاس حکم میں غلو اور مبالغہ تک پہونچائے اسے چھوڑ کر دوسرا حکم اختیار کیا جائے اور یہ ایسے عام پر ہوگا جو اس قیاس سے حکم کا استثناء چاہتا ہو۔

علماء حنابلہ میں ابن قدامہ نے اپنی کتاب روضۃ الناظر میں استحسان کے تین معانی بتائے ہیں۔

(۱) العدول بحکم المسئلة عن نظائرها لدلیل خاص من کتاب او سنة۔

کتاب وسنت کی خاص دلیل کی وجہ سے مسئلہ کا حکم اس کے نظائر سے الگ کرنا۔

(۲) ما یستحسنه المجتهد بعقله

جسے مجتہد اپنی عقل سے اچھا سمجھے۔

(۳) دلیل ینقدح فی نفس المجتهد لا یقدر علی التعبیر عنه۔

ایسی دلیل جو مجتہد کے شعور میں روشن ہو لیکن اس کی تعبیر پر قادر نہ ہو۔

علمائے اصول کی تعریفوں کا ماحصل یہ ہے کہ بعض واقعات میں نص وقیاس ضرورت ومصلحت اور عرف وتعامل کی وجہ سے ایک حکم چھوڑ کر دوسرا حکم اختیار کرنے یا حکم کلی سے کسی جزئیہ کا استثناء کرنے یا عام کے بعض افراد پر کوئی خاص حکم لگا دینے کا نام استحسان ہے، اور جس شرعی دلیل کی وجہ سے پہلا حکم ترک کیا گیا ہے، اس کا نام وجہ استحسان یا سند استحسان ہے۔

استحسان کی انواع اس خلاصہ سے معلوم ہوا کہ استحسان کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں۔

(الف) متبادر قیاس چھوڑ کر خفی قیاس اختیار کرنا (ب) عام کے بعض افراد پر خاص حکم لگانا (ج)

حکم کلی سے کسی جزئی کا استثناء کرنا۔

قسم اول کی مثالیں (۱) ظاہری قیاس کا تقاضا ہے کہ درندہ چڑیوں کا جھوٹا ناپاک ہو۔ جیسا کہ درندہ جانوروں کا جھوٹا ناپاک ہوتا ہے، لیکن یہاں ایک خفی قیاس بھی ہے، جو درندہ جانور اور چڑیوں کے جھوٹے میں فرق چاہتا ہے، درندہ جانور اپنی زبان سے کھاتے پیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا نجس لعاب پسماندہ میں مخلوط ہو جاتا ہے، اور پرندے اپنی چونچ سے کھاتے پیتے ہیں، چونچ خشک ہڈی ہوتی ہے اس میں لعاب نہیں ہوتا، لہذا ان کا لعاب پسماندہ میں مخلوط نہیں ہوتا،

(۲) ایک شخص نے کوئی شئی فروخت کی، خریدنے والے نے ابھی قبضہ نہیں کیا تھا، اور قیمت کی مقدار میں اختلاف ہو گیا، بیچنے والا کہتا ہے کہ میں نے دس روپئے میں فروخت کیا ہے، اور خریدار کہتا ہے کہ میں نے پانچ روپیے میں خریدا ہے۔ ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ بائع زیادتی کا دعویٰ کرتا ہے اور خریدار انکار کرتا ہے، لہذا مدعی کو دلیل پیش کرنا ہوگا اور منکر کو حلف لینا ہوگا، لیکن فقہ میں حکم یہ بتایا جاتا ہے کہ دونوں حلف لیں، اس لئے کہ بائع زیادتی کا دعویٰ کر کے خریدار کے حق کا انکار کرتا ہے، قیمت دینے کے بعد خریدی ہوئی چیز پر قبضہ کرنا اس کا حق ہے، اور دوسری طرف خریدار بھی زیادتی کا انکار کر کے مبیع پر قبضہ کے استحقاق کا دعویٰ کرتا ہے، لہذا جب بائع اور خریدار دونوں حیثیت کے فرق کے ساتھ مدعی بھی ہیں اور منکر بھی، تو دونوں پر حلف ضروری قرار دی گئی۔

(۳) زراعتی زمین کے وقف میں حق مرور اور حق شرب وغیرہ داخل ہے یا نہیں؟ قیاس متبادر کا مقتضیٰ ہے کہ یہ حقوق وقف میں داخل نہ ہوں، اس لئے کہ جس طرح وقف سے شئی موقوف واقف کی ملک سے نکل جاتی ہے، اسی طرح بیع سے بھی فروخت شدہ شئی بائع کی ملک سے نکل جاتی ہے اور زراعتی زمین فروخت کرنے میں یہ حقوق داخل نہیں ہوتے، لہذا وقف میں داخل نہیں ہوں گے، لیکن اس متبادر قیاس پر عمل کرنے سے وقف کا مقصود فوت ہو جاتا ہے، اس لئے بیع پر قیاس کرنے کے بجائے اجارہ پر قیاس کریں گے، جس

طرح وقف کا مقصد شئی موقوف سے منتفع ہونا ہے، اسی طرح اجارہ میں بھی اجرت پوری ہونی شئی سے انتفاع مقصود ہوتا ہے اور زرعی زمین سے انتفاع اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب اس تک پہونچنے کا حق اور پانی کی باری کا حق اور دوسرے حقوق لازمہ حاصل ہوں۔

(۴) اگر کسی شخص پر قرض ہو اور اس کے پاس مال ہو اور قرض خواہ قاضی سے مطالبہ کریں کہ اس کا مال فروخت کر کے ہمارا قرض پورا کیا جائے تو قاضی اس کے مال میں تصرف کا مجاز نہیں ہوگا لیکن قرض اگر درہم کی شکل میں ہو، اور قرض دار کے پاس دینار موجود ہو تو قاضی دینار کو درہم سے فروخت کر سکتا ہے، قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ جب اسے تصرف کا اختیار نہیں تو دینار کو درہم سے فروخت کرنا بھی جائز نہ ہو، لیکن قیاس خفی یہ ہے کہ درہم و دینار ثمنیت میں متحد ہیں اس لئے قاضی ادائے قرض کے لئے ایک ثمن کو دوسرے ثمن میں تبدیل کر سکتا ہے۔

(۵) چار آدمیوں نے ایک شخص پر زنا کی شہادت دی، قاضی نے رجم کا فیصلہ کر دیا، ایک شخص نے رجم کرنے کے بجائے اس کو قتل کر دیا، پھر معلوم ہوا کہ گواہ سب غلام تھے، جن کی شہادت صحیح نہیں تو اس صورت میں قاتل پر دیت واجب ہے۔ قیاس جلی تو یہ ہے کہ قصاص واجب ہو اس لئے کہ اس نے درحقیقت ایک معصوم نفس کو ناحق قتل کیا ہے، معصوم اس لئے کہ شہادت صحیح نہ ہونے کی وجہ سے معلوم ہوا کہ وہ حقیقت میں مباح الدم نہیں تھا، استحسان یہ ہے کہ قصاص واجب نہ ہو، اس لئے کہ قاضی کے فیصلہ پر اعتماد کرتے ہوئے قاتل نے اس کو مباح الدم سمجھا اور مباح الدم کو قتل کرنے سے قصاص واجب نہیں ہوتا، پھر بھی قاتل کو دیت دینی ہوگی، اس لیے کہ اس نے قاضی کے فیصلہ رجم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قتل کیا تھا۔

(۶) کسی شخص نے چوری کی جس کی وجہ سے اس کا ہاتھ کاٹا گیا اور چرائی ہوئی چیز مالک کو واپس کر دی گئی، پھر اس نے بحالہ وہی چیز دوبارہ چرائی تو اس مرتبہ ہاتھ کاٹنے کا حکم نہیں ہوگا، قیاس ظاہر کا مقتضی تو یہ ہے کہ اسے دوبارہ سزا دی جائے، اس لئے کہ یہ جرم پہلے جرم سے زیادہ سخت ہے، اور حدیث "فان عاد فاقطعوہ" کا اقتضا بھی یہی ہے، لیکن یہاں ایک خفی قیاس بھی ہے، فقہ میں یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ جب چور پر

سزا جاری ہو جاتی ہے تو شئی مسروق سے مخلوق کی عصمت و حفاظت اٹھ جاتی ہے، اور وہ اللہ کی حفاظت میں سمجھی جاتی ہے، پھر اگر وہ مالک کی طرف لوٹا دی گئی تو دوبارہ عصمت لوٹ آتی ہے لیکن مالک بھی وہی ہے اور چیز بھی وہی ہے، اس لئے یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شئی کی جو عصمت زائل ہو گئی تھی، وہ دوبارہ حاصل نہ ہو سکی اس شبہ کی بنا پر بعینہ وہی شئی دوبارہ چوری کرنے پر ہاتھ کاٹنے کا حکم نہیں دیا جاتا ہے، اور حدیث "فان عاد فاقطعوہ" کا مطلب یہ ہے کہ اگر دوبارہ دوسری چیز چوری کرے تو اس پر دوبارہ سزا جاری کرو۔

(۷) چوری کی سزا میں پہلی دفعہ دایاں ہاتھ اور دوسری دفعہ بایاں پاؤں کاٹا جائے گا، تیسری اور چوتھی دفعہ امام اعظمؒ کے نزدیک توبہ کرنے تک قید کر دیا جائے گا، اور امام شافعیؒ کے نزدیک بایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں بھی کاٹ دیا جائے گا، امام شافعیؒ کی دلیل وہ احادیث ہیں جو اسی تفصیل کے ساتھ وارد ہوئی ہیں، اور قیاس کا بھی تقاضا ہے کہ جب تک سزا جاری کرنے کا محل باقی رہے، اس وقت تک سزا جاری ہوتی رہے، امام اعظم رحؒ کی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ اثر ہے، "مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ ایک ہاتھ بھی نہ چھوڑوں جس سے وہ کھانا کھا سکے، استنجا کر سکے اور ایک پاؤں بھی باقی نہ رہنے دوں جس سے وہ چل پھر سکے۔"

حضرت علیؓ کا یہ فیصلہ آپ کے "اقضیٰ" ہونے کا ایک واضح ثبوت ہے، یہی وجہ ہے کہ جب آپ نے یہ بات دوسرے صحابۂ کرام کے سامنے پیش کی تو تمام حضرات نے اسے تسلیم کر لیا، یہ فیصلہ ایک قوی الاثر قیاس خفی پر مبنی ہے، کیونکہ اعضائے اربعہ کاٹ دینے کے بعد انسان گویا معنوی طور پر ہلاک ہو جاتا ہے، اس کی پوری منفعت فنا ہو جاتی ہے، اور حد سرقہ زجر کے لئے مشروع ہوئی ہے، نہ کہ پوری منفعت فنا کرنے کے لئے، اس لئے حد کو معنوی ہلاکت تک پہونچنے سے بچایا جائے گا۔

قسم ثانی کی مثال | اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَھُمَا | چوری کرنے والے اور چوری کرنے والی کا ہاتھ کاٹو۔

یہ ایک عام حکم ہے۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عام قحط سالی کے زمانے میں چوری کرنے والے کو اس عام سے خاص کیا ہے، اس لئے کہ قحط سالی کے زمانہ میں آدمی بسا اوقات شدت فاقہ سے مجبور ہو کر چوری کا ارتکاب کرتا ہے، لہذا عام اضطراری حالت میں یہ حکم مرتفع قرار دیا گیا۔

قسم ثالث کی مثال (۱) قاعدہ ہے کہ امین کے ہاتھ میں اگر امانت اس کی زیادتی یا کوتاہی کے بغیر ہلاک ہو جائے تو اس کا تاوان واجب نہیں ہوتا، لہذا اجیر مشترک مثلاً دھوبی، درزی وغیرہ کے پاس جو کپڑا ضائع ہو جائے اس کا تاوان واجب نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن زیادہ اجرت حاصل کرنے کے لئے بسا اوقات اجیر مشترک اپنی طاقت سے زیادہ کام لے لیتا ہے جو شئی کی ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔ اس لئے اس خفی علت کو مؤثر مان کر استحساناً تاوان واجب کیا جاتا ہے۔

(۲) اگر امین مر جائے اور امانت کے بارے میں کچھ نہ بتا جائے کہ وہ موجود ہے یا ضائع ہو گئی یا مالک کو واپس کر دی گئی تو وہ ضامن ہوگا (ضمان اس کے ترکے سے ادا کیا جائے گا) اس لئے کہ امانت میں تجہیل، اس کی حفاظت میں تقصیر ہے۔ لیکن اگر باپ مرے اور اپنے لڑکے کے مال کے بارے میں کچھ نہ بتائے تو وہ ضامن نہیں ہوگا، اس لئے کہ باپ اپنے لڑکے کے مال میں تجارت بھی کر سکتا ہے، اور اس پر خرچ بھی کر سکتا ہے، ممکن ہے تجارت کے خسارہ میں مال فنا ہو گیا ہو یا اس پر خرچ کر دیا ہو۔

دلیل کے اعتبار سے استحسان کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔ استحسان بالنص[۱] استحسان بالعرف[۲]، استحسان بالضرورۃ[۳]، استحسان بالقیاس[۴]۔

استحسان بالنص کسی مسئلہ میں قیاس ظاہر کا تقاضا کچھ ہو، اور نص اس کے علاوہ وارد ہوئی ہو، تو نص کی وجہ سے قیاس کو ترک کر دیا جائے گا، نصوص قرآن و حدیث بہر حال قیاس پر مقدم ہوں گی، چونکہ شارع حکیم مسئلہ کے تمام گوشوں کو دیکھتا اور سمجھتا ہے، یہ ممکن نہیں کہ مسئلہ کی باریکیاں اس کے علم غیب سے مستور ہوں اس لئے اس کا حکم بھی مسئلہ کے تمام اسرار و حکم پر حاوی ہوگا، یہی وجہ ہے کہ اس کا حکم قطعی اور کسی بھی تغیر و

تبدل سے محفوظ ہوتا ہے، اور جب عقل نارسا کی نگاہ اس کی تہ تک نہیں پہونچ سکتی تو کوئی وجہ نہیں کہ فیصلۂ عقل کو فیصلۂ قرآن و حدیث پر راجح قرار دیا جائے۔

بعض احکام غیر قیاسی ہوتے ہیں اور بعض خلاف قیاس، ان دونوں میں فرق ہے، غیر قیاسی وہ احکام کہلاتے ہیں جن میں عقل و قیاس جاری نہیں ہوتا، شارع حکیم ان غیر معقول احکام کو تعبد کے طور پر صادر کرتا ہے تاکہ بندوں کے انقیاد و اطاعت کا امتحان لیا جا سکے، مثلاً نماز کے اوقات، رکعات کی تعداد، زکوٰۃ و صدقات کی مقدار وغیرہ۔ اور خلاف قیاس وہ احکام کہلاتے ہیں، جن میں عقل و قیاس کا مقتضی شارع کے بیان کئے ہوئے حکم کے برعکس ہو، استحسان بالنص میں وہ تمام نصوص آجاتی ہیں جنہیں خلاف قیاس کہا جاتا ہے، مثلاً:

(۱) قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ قہقہہ سے وضو نہ ٹوٹے اس لئے کہ قہقہہ میں بدن سے کوئی نجاست نہیں خارج ہوتی، لیکن حدیث اعرابی اور بعض دوسرے آثار کی وجہ سے حنفیہ نے قیاس کو ترک کر دیا۔

(۲) موزے میں پائخانہ لگ کر خشک ہو جائے تو زمین پر رگڑ کر صاف کر دینے سے پاک ہو جاتا ہے، قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ جس طرح کپڑے اور بدن پر نجاست لگ جانے سے دھلنا واجب ہو جاتا ہے، اسی طرح موزہ بھی بغیر دھلے ہوئے پاک نہ ہو۔ لیکن حدیث میں آتا ہے کہ موزے میں پائخانہ لگ جائے تو مٹی اس کے پاک کرنے کا ذریعہ ہے اذا وطئ احدکم الاذی بخفیہ فطھورھا التراب۔

(۳) مشترک نماز میں عورت اگر مرد کے مقابل آجائے تو مرد کی نماز فاسد ہو جاتی ہے، قیاس کا مقتضی تو یہ ہے کہ جس طرح عورت کی نماز فاسد نہیں ہوتی، مرد کی نماز بھی فاسد نہ ہو، لیکن "اخروھن من حیث اخرھن اللہ" (عورتوں کو مؤخر رکھو جیسا کہ اللہ نے انہیں مؤخر رکھا ہے) اور بعض دوسرے آثار سے قیاس کو ترک کر دیا گیا۔

(۴) روزہ کی حالت میں جو شخص بھول کر کھا پی لے اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا قیاس تو یہ چاہتا ہے کہ جب روزہ کھانے پینے سے رکنے کا نام ہے تو کھا پی لینے سے روزہ ٹوٹ جائے، لیکن متعدد احادیث کی بنا پر یہاں

قیاس کو چھوڑ دیا گیا۔

جاء رجل الی رسول اللہ صلی اللہ	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک
علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ صلی اللہ	آدمی آیا اور کہا اے اللہ کے رسولؐ!
علیہ وسلم انی اکلت وشربت	روزہ کی حالت میں بھول کر میں نے کھا پی
ناسیاً وانا صائم فقال:	لیا ہے، فرمایا: اللہ ہی نے تمہیں کھلایا
اللہ اطعمک وسقاک (ابوداؤد)	اور پلایا ہے۔

(۵) امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک منقولی چیزوں کا وقف درست نہیں، اس لئے کہ وقف میں جب موقوفہ شئی کسی شخص کی ملک میں نہیں جاتی تو اس میں مصرف کی ایسی جہت ذکر کرنا ضروری ہے جو منقطع نہ ہو، اور اشیاء منقولہ عدم بقا کی وجہ سے تابید کی صلاحیت نہیں رکھتیں، اس لئے جنگی گھوڑے، زرہ اور ہتھیار وغیرہ کا وقف صحیح نہیں ہونا چاہئے، لیکن امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کی بنا پر ان کا وقف جائز قرار دیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا:

قد احتبس ادراعہ واعتدہ	انہوں نے اپنی زرہیں اور ہتھیار اللہ
فی سبیل اللہ۔	کی راہ میں روک رکھے ہیں۔

استحسان بالعرف کسی مسئلہ میں نص یا قیاس کا مقتضیٰ کچھ ہو اور لوگوں کا عرف و تعامل اس کے برعکس ہو تو عرف کی رعایت کرتے ہوئے مقتضائے نص و قیاس پر عمل ترک کر دیا جائے گا، مثلاً:

(۱) "لاتبع مالیس عندک" (الحدیث) کا مقتضیٰ یہ ہے کہ غیر موجود شئی کی خرید و فروخت ناجائز ہو جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک استصناع[1] پر عرف جاری ہے،

[1] استصناع: صانع سے کوئی چیز بنانے کے لئے کہنا، اسکی صورت یہ ہے کہ مثلاً موچی سے کہے "میرے لئے اتنے نمبر میں اس قسم کا ایک موزہ اپنے مال سے تیار کردو" (مجمع الانہر ۲: ۲۰۶)

استصناع میں غیر موجود شئی کی خرید و فروخت ہوتی ہے، اس عرف و عادت کی وجہ سے بیع معدوم کی نہی سے استصناع کا حکم علحدہ کر لیا گیا۔

(۲) امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اشیائے منقولہ کا وقف درست نہیں جیسا کہ مذکور ہوا، اس لئے کتابیں، کپڑے، کدال، جنازہ کی چارپائی وغیرہ وقف کرنا درست نہیں ہونا چاہئے، لیکن عرف و تعامل کی وجہ سے امام محمدؒ نے ان کا وقف جائز قرار دیا ہے، اور علمائے مشائخ نے اسی پر فتویٰ دیا ہے۔

پہلی مثال نص کے مقابلہ میں استحسان بالعرف کی ہے، اور دوسری مثال قیاس کے مقابلہ میں استحسان بالعرف کی ہے۔ بادی النظر میں یہاں ایک سوال پیدا ہونا چاہئے، کہ کیا نص کے مقابلہ میں عرف کا اعتبار کیا جا سکتا ہے؟ فقہ کا یہ اصول ہے کہ منصوص علیہ کے مقابلہ میں عرف کا اعتبار نہیں ہوتا، العرف غیر معتبر فی المنصوص علیہ،

مگر یہ سوال اس وقت پیدا ہو سکتا تھا جبکہ استصناع کا عدم جواز قرآن و حدیث میں صراحۃ مذکور ہوتا اور عرف کی وجہ سے اس کو جائز قرار دیا جاتا، حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ استصناع کو ایک منصوص قاعدہ کلیہ کے ضمن میں لاکر اس کا عدم جواز سمجھ میں آتا ہے، متعین طور پر استصناع کے عدم جواز پر کوئی نص وارد نہیں، جس سے عرف کا معارضہ متحقق ہو سکے۔

درحقیقت وہ اصول اپنی جگہ درست ہے، لیکن ہمیں یہ معلوم ہے کہ شریعت نے حکم کلی کے مقابلہ میں بعض مخصوص عرف کا اعتبار کیا ہے، خود شارع علیہ السلام نے "لاتبع مالیس عندک" کے قاعدہ کلیہ سے بیع سلم[1] کا استثناء کیا ہے، جس سے مجتہد یہ سمجھ سکتا ہے کہ کسی واقعہ میں حکم کلی جاری کرنے کے بجائے عرف کا لحاظ کیا جا سکتا ہے۔

[1] نقد قیمت کے عوض ادھار چیز خریدنا، مثلاً بائع سے کہے کہ فلاں قسم کا اچھا گیہوں سو کیلو نقد دو سو روپے میں خریدتا ہوں، دو مہینے میں فلاں جگہ آپ گیہوں ادا کر دیں۔

استحسان بالضرورۃ کسی مسئلہ میں قیاس کا مقتضیٰ کچھ ہو اور ضرورت کا تقاضا اس کے علاوہ ہو تو ضرورۃ کی بنا پر مقتضیٰ قیاس سے مسئلہ کا حکم علیحدہ کر لیا جائے گا، مثلاً:

(۱) قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ کنواں ناپاک ہونے کی صورت میں جب تک اس کا کل پانی نکال کر اس کی تہ اور دیواریں دھو نہ لی جائیں، اس کے پاک ہونے کا حکم نہ دیا جائے، لیکن یہ ناممکن کی حد تک دشوار ہے، اس لئے مقتضیٰ قیاس پر عمل نہ کرتے ہوئے حکم دیا گیا کہ کنویں کا تمام پانی نکال لینا اسکی طہارت ہے۔

(۲) بھیڑ، بکری کی مینگنیاں ناپاک ہیں، اگر وہ کنویں میں گر جائیں تو کنواں ناپاک ہونا چاہئے لیکن کھلے میدان اور کھیتوں میں جو کنویں ہوتے ہیں، ان کا محفوظ رہنا دشوار ہے، اسکے ارد گرد جانور چرتے رہتے ہیں، اور ہوا کے ذریعہ ان کا پائخانہ کنویں میں پڑتا ہے، ایسی صورت میں اگر ناپاکی کا حکم دیا جائے تو حرج پیدا ہوگا، رفع حرج کے لئے اگر کنویں میں تھوڑی مینگنیاں پڑ جائیں تو کنواں پاک ہی شمار کیا جاتا ہے۔

(۳) شرکت مفاوضہ یعنی دو آدمی اپنے مال اور تجارت کے تمام تصرفات میں شریک ہو جائیں تو ان میں سے جو بھی کچھ خریدے گا، وہ شرکت میں سمجھا جائے گا، ہاں اگر اپنا یا اپنے اہل وعیال کا کھانا کپڑا خریدے تو شرکت میں نہیں سمجھا جائے گا۔ قیاس کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ یہ بھی شرکت میں شمار ہو، اس لئے کہ شرکت مفاوضہ میں خرید وفروخت کے تمام تصرفات شرکت پر سمجھے جاتے ہیں، لیکن اپنا اور اپنے اہل وعیال کا نفقہ شریک پر ڈالنا نامعقول ہے اور لازمی طور پر ہر شخص کو اس کی ضرورت پیش آتی ہے، اس ضرورت کی بنا پر اہل وعیال کے کھانے کپڑے اور دیگر نفقات کا استثناء کرنا پڑا۔

مذکورہ مثالوں میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ استحسان بالضرورۃ میں "ضرورت" سے مراد عام ہے، ضرورت لازمہ ہو، یا ضرورت غالبہ، محال ہو یا دشوار، بلکہ رفع حرج اور جلب مصلحت کو بھی ضرورت سمجھ لیا جاتا ہے۔

شریعت میں ایسے احکام پائے جاتے ہیں جہاں ضرورت کی بنیاد پر احکام میں آسانی اور سہولت پیدا کر دی جاتی ہے، حالت اضطرار میں بقائے حیات ایک ضرورت ہوتی ہے، جس کے لئے خمر و خنزیر یا دم مردار وغیرہ کا کھانا جائز قرار دیا گیا ہے۔ درخت پر لگی ہوئی کھجور کا اندازہ کرکے کٹی ہوئی کھجور سے مبادلہ، جسے بیع عرایا کہتے ہیں، ضرورت ہی کی بنا پر جائز ہے، غریب لوگ جن کے پاس کھجور کے ایک دو درخت ہوا کرتے تھے، پھل پکنے کے انتظار میں مبتلائے فاقہ ہو سکتے تھے، اس ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے درخت پر لگی ہوئی کھجور کا اندازہ کرکے کٹی ہوئی تیار کھجور دینا جائز قرار دیدیا، حالانکہ اس میں کھجور کی کھجور سے خرید وفروخت اندازہ سے ہوتی ہے، جو ربا ہے لیکن ضرورت کی بنا پر جائز ہے، انہیں دلائل کو بنیاد بنا کر ضرورت کی وجہ سے قیاس کو ترک کرنے کا اصول اپنایا گیا۔

استحسان بالقیاس الخفی کسی مسئلہ میں ظاہری اور متبادر قیاس کا مقتضیٰ کچھ ہو اور خفی قیاس کا مقتضیٰ اس کے علاوہ ہو تو متبادر قیاس چھوڑ کر خفی قیاس پر عمل کیا جائے گا، استحسان کی تقسیم اول میں اسکی مثالیں گزر چکی ہیں۔

قیاس ظاہر کو ترک کرنا اس وجہ سے نہیں کہ وہ ظاہر ہے اور قیاس خفی کو ترجیح دینا اس وجہ سے نہیں کہ وہ خفی ہے، درحقیقت ترجیح قوت وضعف پر مبنی ہے، بعض قیاس کا اثر قوی اور بعض کا اثر ضعیف ہوتا ہے ضعیف الاثر قیاس بہر حال قوی الاثر قیاس کے مقابلہ میں ترک کر دیا جائے گا، تلاش وجستجو سے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری قیاس عموماً ضعیف الاثر اور خفی قیاس قوی الاثر ہوتا ہے، اسی لئے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ قیاس خفی، قیاس جلی پر مقدم ہے، ابن ہمامؒ نے ایک جگہ بحث کرتے ہوئے کہا ہے:

لا ترجیح للخفی لخفائہ ولا للظاہر لظہورہ	خفی کو خفی ہونے اور ظاہر کو ظاہر ہونے
بل یرجع فی الترجیح	کی وجہ سے ترجیح نہیں بلکہ ترجیح ان معانی کی وجہ
الی ما اقترن بہا من المعانی	سے ہے جن پر قیاس مشتمل ہے، ہاں

......غیر ان استقر أثرهم الخ — جب جستجو نے خفی کے مقابلہ میں ظاہر متبادر
فلۃ قوۃ الظاہر المتبادر — کی قوت کا کم ہونا ثابت کیا
بالنسبۃ الی الخفی المعارض له (فتح ۲: ۲۰۲) ہے - (باب سجود التلاوۃ)

استحسان پر قیاس کی ترجیح یہاں پہونچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کیا ایسے مقامات بھی ہیں جہاں استحسان پر قیاس کو مقدم کیا جاتا ہے؟ جواب ظاہر ہے کہ جب ترجیح کا مدار قوت وضعف پر ہے اور قیاس جلی وخفی میں سے کسی کا قوی وضعیف ہونا ممکن ہے تو قیاس جلی کا قیاس خفی پر مقدم ہونا بھی ممکن ہے عقلاً یہاں چار صورتیں پیدا ہوتی ہیں:

(۱) قیاس جلی قوی ہو اور قیاس خفی بھی قوی ہو (۲) قیاس جلی ضعیف ہو اور قیاس خفی بھی ضعیف ہو (۳) قیاس جلی قوی ہو اور قیاس خفی ضعیف ہو (۴) قیاس جلی ضعیف ہو اور قیاس خفی قوی ہو۔

پہلی صورت میں قیاس جلی کے مقتضیٰ پر عمل ہوگا اس لئے کہ دونوں قوت میں برابر ہیں، اور قیاس جلی میں ظاہر ومتبادر ہونے کا وصف زائد ہے، جس کی وجہ سے وہ راجح ہوگا، دوسری صورت میں یا تو دونوں ضعیف ہونے کی وجہ سے ساقط ہو جائیں گے، یا قیاس جلی پر عمل ہوگا، وجہ وہی ہے جو پہلی صورت میں مذکور ہے، تیسری صورت میں قیاس جلی قوی ہونے کی وجہ سے قیاس خفی یعنی استحسان پر مقدم ہوگا، چوتھی صورت میں قیاس خفی (استحسان) قوی ہونے کی وجہ سے قیاس جلی پر مقدم ہوگا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تین یا کم از کم دو صورتوں میں قیاس، استحسان پر مقدم ہوگا، صرف چوتھی صورت میں استحسان قیاس پر راجح ہوتا ہے۔ تتبع اور تلاش سے معلوم ہوتا ہے کہ قیاس جلی کا قوی ہونا بہت نادر ہے علامہ ابن نجیم مصری نے شرح منار میں گیارہ مقامات شمار کرائے ہیں جہاں استحسان پر قیاس کو مقدم کیا جاتا ہے، لیکن اس تعداد میں انحصار ضروری نہیں، چنانچہ اجناس ناطفی میں اسکی

تعداد بیس سے زائد تک پہونچائی ہے۔ اس سلسلہ کی ایک مشہور مثال درج ذیل ہے۔

آیت سجدہ پڑھ کر رکوع میں گیا اور رکوع ہی میں ادائیگی سجدہ کی نیت کرلی، قیاس کا تقاضا ہے کہ رکوع سے سجدہ ادا ہو جائے اس لئے کہ قرآن میں سجدہ پر رکوع کا لفظ بولا گیا ہے۔

وَخَرَّ رَاكِعًا وَّأَنَابَ — (داؤد علیہ السلام) سجدہ میں گر پڑے، اور (اللہ کی طرف) رجوع کیا۔

اور استحسان یہ ہے کہ رکوع سے سجدہ ادا نہ ہو، اس لئے کہ آیت سجدہ کی تلاوت سے سجدہ واجب ہوا ہے اور رکوع میں سجدہ سے کم تعظیم کا اظہار ہوتا ہے، لیکن یہاں استحسان کا اثر ضعیف ہے اس لئے کہ سجدۂ تلاوت قربت مقصودہ نہیں بلکہ اصل مقصود تواضع ہے، اور نماز میں رکوع سے تواضع کا اظہار ہو جاتا ہے، لہٰذا رکوع سے سجدۂ تلاوت ادا ہو جائے گا، چنانچہ ابن مسعود اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی بھی ہے کہ انہوں نے رکوع سے سجدۂ تلاوت کی ادائیگی درست قرار دی ہے۔

استحسانی حکم کا متعدی ہونا استحسان بالنص میں چونکہ نص، قیاس کے خلاف وارد ہوتی ہے، اور خلاف قیاس کو اس کے مقام پر محدود رکھا جاتا ہے، اس لئے جو حکم نص کی وجہ سے مستحسن ہوگا وہ متعدی نہیں ہوگا لیکن اگر ان وجوہ ومعانی کو سمجھ لیا جائے جو نص کے خلاف قیاس وارد ہونے میں مؤثر ہیں تو جن فروعات میں یہ وجوہ موجود ہوں گی، ان میں حکم مستحسن جاری کردیا جائے گا، مثلاً کٹی کھجور کے عوض درخت پر لگی کھجور کی اندازہ سے خرید وفروخت ضرورت وحاجت کی بنا پر حدیث میں جائز قرار دی گئی ہے، اور اسی طرح کی حاجت توڑے ہوئے انگور کے عوض درخت پر لگے ہوئے انگور کی خرید وفروخت میں ہے، لہٰذا اس صورت میں بھی جواز کا حکم دیا گیا،

استحسان بالعرف اور استحسان بالضرورت میں بھی حکم مستحسن متعدی نہیں ہوتا، ہاں استحسان بالقیاس میں حکم مستحسن متعدی ہوتا ہے، فقہائے کرام اس کی مثال مسئلۂ تحالف سے دیتے ہیں، جس کی تقریر قسم اول کی مثال ۲ میں گزر چکی ہے، اس صورت میں اگر بائع ومشتری مرجائیں تو تحالف کا حکم دونوں کے ورثہ کی طرف متعدی

ہوتا ہے، چونکہ بائع اور مشتری میں سے دونوں مدعی اور منکر بن سکتے ہیں جس کی وجہ سے دونوں پر قسم واجب کی گئی ہے، اور یہی صورت ورثہ میں بھی ہے، اس لئے یہاں بھی تحالف کا حکم دیا گیا،

استحسان کی حجیت میں اختلاف

جمہور حنفیہ، مالکیہ و حنابلہ استحسان کی حجیت پر متفق ہیں، ان کے نزدیک استحسان ایک شرعی دلیل ہے، جس سے قیاس اور حکم کلی کے مقابلہ میں احکام ثابت کئے جاتے ہیں لیکن امام شافعیؒ نے اپنی کتاب "الرسالۃ" اور کتاب "الام" کے مختلف مقامات پر حجیت استحسان کی پرزور تردید کی ہے، ان کے نزدیک استحسان سے کسی مسئلہ کا حکم ثابت کرنا تلذذ و تشہی اور ہوائے نفس کی اتباع کرنا ہے، جس کی اجازت کسی مجتہد یا مفتی کو بالکل نہیں دی جا سکتی، انہوں نے فرمایا کہ ایک مسلمان کو جب کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو اس میں کتاب و سنت کا کوئی فیصلہ موجود ہوگا، اگر شریعت کا کوئی حکم موجود ہے تو ایک مسلمان کے لئے اس کی اتباع سے چارۂ کار نہیں، اور اگر اس کا حکم موجود نہیں تو کتاب و سنت کی روشنی میں قیاس و اجتہاد کے ذریعہ اس کا حکم دریافت کیا جائے گا، اور اس پر عمل کیا جائے گا اور بس۔ اگر اصول کی ان حدود سے گزر کر اس کا یہ خیال ہو کہ اس واقعہ میں جو حکم نفس کو مستحسن اور اچھا لگے وہی اسکا حکم قرار دیا جائے تو یہ مستحسن حکم اس کے اوپر پھینک دیا جائے گا، جس طرح کتاب و سنت کے علاوہ پر اجتہاد کرنے والے کا اجتہاد رد کر دیا جاتا ہے، کتاب الام کے ایک مقام پر انہوں نے فرمایا ہے:

لا یجوز لمن استأھل ان یکون	جو شخص حاکم یا مفتی ہونے کا اہل ہو اسے
حاکما او مفتیا ان یحکم ولا ان	خبر لازم کی جہت سے ہی فیصلہ کرنا یا
یفتی الا من جھۃ خبر لازم	فتویٰ دینا جائز ہے اور یہ کتاب یا
وذالک الکتاب أو السنۃ	سنت ہے یا اہل علم کے غیر مختلف فیہ اقوال
او ما قال اھل العلم لا یختلفون	ہیں یا ان میں سے کسی پر قیاس ہے استحسان
فیہ أو قیاس علی بعض ھذا	کے ذریعہ فتویٰ دینا جائز نہیں ہے، اس

ولا یفتی بالاستحسان اذ لم	لئے کہ استحسان نہ ان میں سے کوئی ہے،
یکن الاستحسان واحدا من ھذہ المعانی	اور نہ کسی کے معنی میں ہے۔

ایک دوسرے مقام پر انہوں نے فرمایا:

لو جاز تعطیل القیاس جاز	(استحسان کے ذریعہ) اگر قیاس کو معطل
لاھل العقول من غیر اھل العلم	کرنا جائز ہوتا تو جاہلوں میں جو لوگ
ان یقولوا فیما لیس فیہ خبر بما یحضرہم	عقل والے ہیں ان کو جائز ہوتا کہ غیر منصوص
من الاستحسان وان القول	میں اپنے نفس کے استحسان کے مطابق
بغیر خبر ولا قیاس لغیر جائز	مسئلہ بتاتے، حقیقت یہ ہے کہ خبر (قرآن
(الرسالہ: ۷۰)	و حدیث) اور قیاس کے بغیر مسئلہ بتانا
	جائز ہی نہیں۔

خلاصہ یہ کہ امام شافعیؒ ایک مسلمان کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں کہ اللہ و رسول کے حکم کی اتباع کرے یا ان احکام پر مبنی قیاسی حکم کی اتباع کرے، مجتہد کا پسند کیا ہوا حکم، شرعی حکم نہیں بلکہ وہ نفس و ہوا کا حکم ہے، جس کی اتباع باعث اجر نہیں باعث وزر ہے،

ان دونوں مذاہب کے علاوہ ایک تیسرا مذہب بھی ہے کہ استحسان ضرور ایک شرعی دلیل ہے، اسے مسائل کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے، لیکن یہ کوئی مستقل شرعی دلیل نہیں، اقسام استحسان پر نظر ڈالنے کے بعد یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ استحسان ادلۂ اربعہ سے منفرد کوئی شرعی دلیل نہیں، اگر استحسان بالنص ہے تو حقیقت ہم کتاب و سنت پر عمل کر رہے ہوتے ہیں، اگر استحسان بالعرف ہے تو اجماع پر اور استحسان بالقیاس الخفی ہے تو فی الواقع قیاس پر عمل کر رہے ہوتے ہیں، اس طرح استحسان کی تمام انواع کا مرجع یہی دلائل اربعہ ہیں گویا معتبر استحسان کا محل وقوع ان حدود اربعہ سے باہر نہیں۔

شوکانی صاحب نیل الاوطار کا یہی مسلک تھا، انہوں نے استحسان کی بحث ختم کرتے ہوئے کہا ہے:

ہماری تمام باتوں سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا	فقد عرفت بمجموع ما ذکرناه
کہ مستقل بحث میں استحسان کے ذکر کا کوئی	ان ذکر الاستحسان فی بحث مستقل
فائدہ نہیں، اس لئے کہ اگر وہ گذشتہ	لا فائدة فیه اصلاً لانه ان کان
دلائل (اربعہ) کی طرف راجع ہے، تو	راجعاً الی الادلة المتقدمة فهو
تکرار ہوگا اور اگر ان سے خارج ہے تو	تکرار وان کان خارجاً عنها
شریعت میں اس کا کوئی مقام نہیں۔	فلیس من الشرع فی شئ۔

استحسان کی حجیت پر جمہور کے دو دلائل زیادہ واضح ہیں:

(۱) جو بھی واقعہ منصۂ شہود پر آتا ہے اس کے گرد قرائن کا ایک ہالہ ہوتا ہے، اس کے خاص ظروف و احوال ہوتے ہیں، اس کی ایک مخصوص فضا ہوتی ہے، اگرچہ ہم ان قرائن و ظروف سے صرفِ نظر کرکے نفسِ واقعہ پر قیاس جلی یا حکم کلی جاری کر سکتے ہیں لیکن قرائن سے آنکھیں بند کرکے واقعہ کا حکم صادر کرنا بسا اوقات کسی مفسدہ تک پہونچا دیگا، حرج و ضرر کا باعث ہوگا یا مصلحت عامہ کو فوت کر دے گا، جبکہ تشریع کا مقصد عام جلب منفعت اور دفع مضرت ہے۔ شریعت نے ہمیں کسی عبث کا حکم نہیں دیا ہے، ضرور ہے کہ اسکے احکام میں بندوں کا جسمانی و روحانی، دنیوی و اخروی فائدہ ہو یا کسی ایسے ضرر سے بچایا گیا ہو جو ان کی زندگی میں تنگی پیدا کرنے کا باعث ہوتا۔ ایسی صورت میں اگر مجتہد کو بعض واقعات میں ان کے مخصوص ظروف و احوال کا لحاظ کرتے ہوئے حکم کلی یا قیاس جلی سے ہٹ کر حکم صادر کرنے کی اجازت نہ ہوگی تو لوگوں کو مستقل پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا، اسی "عدول" کو ہم استحسان کہتے ہیں۔

(۲) اگر ہم نصوص شرعیہ کی جستجو کریں تو معلوم ہوگا کہ شارع حکیم نے بعض واقعات میں قیاس کے ظاہری مقتضی کو ترک کر دیا ہے، یا حکم کلی میں داخل بعض جزئیات کا استثناء کر دیا ہے، اور ایسا کسی مصلحت

کی رعایت یا کسی نقصان سے بچنے کے لئے ہی کیا ہے، مثلاً مردار، خون، خنزیر، خمر وغیرہ حرام ہونے کے باوجود اضطراری حالت میں ان کا استعمال درست قرار دیا گیا ہے، یا کفر حرام ہونے کے باوجود حالت اکراہ میں زبان پر کلمۂ کفر کی اجازت دی گئی ہے، اضطرار اور اکراہ کی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے حرمت کا حکم ترک کرکے اباحت کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معدوم کی خرید و فروخت سے منع کرنے کے باوجود عرف و ضرورت کی بنیاد پر بیع سلم کو جائز قرار دیا ہے، سود حرام ہونے کے باوجود کی کھجور کے عوض درخت پر لگی کھجور کی خرید و فروخت اندازہ سے جائز قرار دیا ہے، جب کہ اس میں کمی بیشی کا غالب امکان ہے، ان منصوصات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ کے ماحول اور اس کے خارجی مؤثرات کی رعایت کرتے ہوئے اصل قیاسی حکم چھوڑا جا سکتا ہے یا عرف و ضرورت اور مصلحت کی وجہ حکم کلی سے بعض جزئیات کو مستثنی کیا جا سکتا ہے۔

اختلاف کی تنقیح مختصر انداز میں یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ استحسان کی حجیت میں اختلاف محض لفظی نزاع ہے، جمہور اس استحسان کو حجت مانتے ہیں جو کسی شرعی دلیل پر مبنی ہو، امام شافعیؒ اس استحسان کی تردید کرتے ہیں جو بے دلیل ہو، انہوں نے جس استحسان کی تردید کی ہے وہ جمہور کا استحسان نہیں، ان کے استحسان کا معنی ہے "بھلا لگنا" اور جمہور کے استحسان کا مطلب ہے "دلیل کی روشنی میں ایک حکم کے مقابلہ میں دوسرے حکم کو اچھا سمجھنا"۔

ظاہری بات ہے کہ اس تنقیح کے بعد اختلاف محض لفظی ہو کر رہ جاتا ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ مجتہد کے جی میں کسی واقعہ سے متعلق ایک حکم بھلا لگ جائے تو استحسان ہے، اسی طرح امام شافعیؒ بھی یہ نہیں کہتے کہ مثلاً بیع معدوم کی نہی سے بیع سلم کا استثناء جائز و ثابت نہیں جسے ہم استحسان بالنص کہتے ہیں یا بیع معدوم کی نہی سے استصناع کو علیحدہ کرنا درست نہیں، جسے ہم استحسان بالعرف کہتے ہیں یا ضرورت کی وجہ سے بعض جزئیات کو حکم کلی سے خارج کرنا صحیح نہیں، جسے ہم استحسان بالضرورۃ کہتے ہیں، یا قوی قیاس کو ضعیف قیاس

پر ترجیح دینا درست نہیں، جسے ہم استحسان بالقیاس الخفی کہتے ہیں۔ ابن سمعانیؒ نے ان الفاظ میں اختلاف کا محاکمہ کیا ہے۔

ان کان الاستحسان ھو القول	اگر استحسان یہی ہے کہ آدمی کو جو پسند ہو اور
بما یستحسنہ الانسان ویشتھیہ	جو اس کی خواہش ہو، بغیر دلیل کے اس
من غیر دلیل فھو باطل ولا	کا قائل ہو جائے تو یہ باطل ہے اور یہ کسی کا
یقول بہ احد وان کان	مسلک نہیں، اور اگر استحسان
الاستحسان ھو العدول	ایک دلیل کے مقتضیٰ سے ہٹ کر دوسری
عن موجب دلیل الی موجب	قوی تر دلیل کی طرف رجوع کا نام
اقوی منہ فھذا مما لا ینکرہ احد	ہے تو اس کا کوئی منکر نہیں۔

شاطبیؒ نے موافقات میں استحسان پر تشہی کے الزام کو رد کرتے ہوئے کہا ہے:

من استحسن لم یرجع الی مجرد	جو استحسان کرتا ہے وہ محض اپنے ذوق
ذوقہ وتشھیہ وانما رجع	و خواہش کی طرف رجوع نہیں کرتا بلکہ
الی ما علم من قصد الشارع	پیش آمدہ واقعات کے (منصوص)
فی الجملۃ فی امثال تلک	نظائر میں اس نے شارع کا جو مقصد
الاشیاء المفروضۃ	سمجھا ہے، اسی مقصد کی طرف رجوع کرتا ہے۔

اب صرف یہ مسئلہ رہ جاتا ہے کہ استحسان مستقل شرعی دلیل ہے یا نہیں؟ استحسان کی اقسام پر نظر کرتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادلۂ اربعہ سے الگ یہ کوئی مستقل دلیل نہیں ہے، دلیل استحسان یا تو نص ہوگی یا اجماع یا قیاس، اب صرف اصطلاح کا نزاع رہ جاتا ہے کہ دو متعارض دلیلوں میں سے کسی مرجح کی بنا پر ایک کو راجح قرار دینا اصطلاح میں استحسان کہلا سکتا ہے یا نہیں؟ اصطلاح کا اختلاف کوئی اختلاف نہیں، ہر ایک مجتہد بعض معانی و مفاہیم کیلئے مخصوص اصطلاح اختیار کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کے ایک خط پر اظہار رائے

(۱)

جامعہ ڈربن
۱۴ر جون ۸۳ء

مخدوم و محترم جناب صباح الدین صاحب مدظلہ العالی۔ سلام و رحمت فراوان

والا نامہ ملا، دعاؤں، محبت و شفقت کا پیام لایا، ساتھ ہی مئی ۱۹۸۳ء کا معارف بھی موصول ہوا، صفحات ۳۸۹ - ۳۹۰ پر مخدوم و محترم جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب مدظلہ کا مراسلہ نظر سے گذرا، ایک معروف اسکالر کے نوک قلم سے اس مراسلہ کا صدور ناچیز کے لئے باعث صد حیرت ثابت ہوا، کوئی اور ہوتا تو شاید جواب دینے کی زحمت بھی گوارا نہ کرتا مگر چونکہ یہ تحریر ایک پایہ کے عالم کی ہے، لہذا علمی دیانت کا تقاضا تصور کرتا ہوں کہ اپنی حقیر رائے سے بھی آپ کو مطلع کر دوں، اِن اُرِیدُ اِلّا الاصلاح۔

اپنی رائے کے اظہار سے پہلے اس عقیدت کا انکشاف ضروری ہے جو مجھے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے رہی ہے اور ہنوز باقی ہے۔

مغربی دنیا میں عصر حاضر کے تین مسلم تابندہ ستاروں نے اسلام کی روشنی پھیلائی ہے، جن کی کرنیں چھن کر ہم تک یورپ میں فکر و نظر کی تاریک راہوں پر بچھائی ہیں، ان کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں، لیکن ان کی خدمات جلیلہ کا اعتراف تقاضائے دانش ہے، انھیں کی بدولت ایک طرف یورپ کے بھٹکے ہوئے مسلم طلبہ نے راہ پائی اور دوسری طرف مسیحی گروہان گو سفندان اسلام کے متعلق سنجیدگی کے ساتھ سوچنے پر مجبور ہوئے، پہلی شخصیت اے۔ ایل۔ طباوی مرحوم کی تھی، جن کا وصال

چند ماہ قبل لندن میں ایک حادثہ میں ہوا، دوسری شخصیت سید حسین نصر کی ہے، جنہوں نے علوم اسلامیہ خاصکر اسلامی سائنس میں مسلم دانشوروں کی خدمات کو اس طرح پیش کیا کہ اہل یورپ ہل گئے، اور اعتراف اور عدم اعتراف کی کشمکش میں مبتلا ہوگئے، تیسری شخصیت حضرت ڈاکٹر حمید اللہ کی ہے، جو گذشتہ چار یا پانچ عشرات سے تہذیب نو کے قبلہ پیرس میں اسلام اور علوم اسلامیہ کی سربلندی کے لئے سرگرم و سرشار ہیں۔ اے۔ ایل طباوی صاحب نے خالص علمی انداز میں سب سے پہلے مستشرقین کے کید و مکر کا پردہ چاک کیا، جس نے یورپ میں پڑھنے والے مسلم طلبہ کو اچانک چونکا دیا، موصوف کا پہلا رسالہ زیر عنوان "انگریزی داں مستشرقین" ۱۹۶۴ء میں لندن سے شائع ہوا، اور دوسرا رسالہ ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا، بیدار مغز اور حساس مسلم اسکالر بھی چونکے، اور مستشرقین کی اسلام دشمنی یا تمسخ اسلام اور علوم اسلامیہ کے خلاف علمی حلقوں میں ایک تحریک کی داغ بیل پڑ گئی، تحدیث نعمت کے طور پر اس امر کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ ناچیز کے تعلقات ان تینوں اسکالر کے ساتھ بے حد قریبی رہے ہیں، اور ہنوز قائم ہیں (اللّٰھم زد فزد)

ڈاکٹر حمید اللہ سے ملنے کے لئے ناچیز ۱۹۷۰ء میں پیرس پہنچا، آستانہ حمیدیہ کی تلاش میں جو محنت ناچیز نے کی، شاید ہی کسی اسکالر کی تلاش میں عمر بھر کی ہو۔ بیگم قدسیہ ناچیز کی جنوپائی سے تھک تھک کر بیٹھ گئیں، مگر ہمت نہ ہاریں، آخر ہم علم کے اس آستانہ پر پہنچے، یہ معلوم کرکے بے حد غم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اُن دنوں پیرس سے باہر تھے، ہم ڈاکٹر صاحب کے دروازہ کو چوم کر واپس آگئے، (واضح رہے کہ ناچیز نہ تو بدعتی ہے نہ ہی ضعیف العقیدہ، البتہ علماء ورثۃ الانبیاء کی قدم بوسی کو فعل نیک تصور کرتا ہے) جولائی ۱۹۷۳ء میں انتیسویں [29] بین الاقوامی مستشرقین کانفرنس کا انعقاد پیرس کی معروف یونیورسٹی دانش گاہ ساربان میں ہوا۔ ناچیز بھی مدعو تھا، سفر خرچ بھی کانفرنس والوں نے ہی فراہم کیا تھا، تمناؤں کے ساتھ گیا کہ ڈاکٹر حمید اللہ

صاحب سے ملاقات کا ایک اور موقع ہاتھ آیا، لیکن اس دفعہ بھی محرومی ہی نوشتۂ تقدیر تھی، آخر ۱۹۷۴ء میں کراچی میں پیر حسام الدین صاحب راشدی کے مکان پر ایک عشائیہ میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی اور علمی مذاکرات کا موقع نصیب ہوا، چند سال ہوئے کہ جنوبی افریقہ میں ڈاکٹر صاحب سے نیاز حاصل ہوا، اور استفادہ کا موقع بھی ملا۔ ان کے اخلاص، انکسار، محبت اور شفقت کا جواب نہیں۔

چونکہ ڈاکٹر صاحب کا یہ خط نہ صرف دار المصنفین اعظم گڈھ کی کانفرنس منعقدہ فروری ۱۹۸۲ء کے حق میں منفیانہ حیثیت رکھتا ہے، بلکہ ان تمام کاوشات، سرگرمیوں، اجتماعات اور کانفرنسوں کے بھی خلاف ہے جو "اسلام اور مستشرقین" کے سلسلے میں جہاں کہیں منعقد کی جاتی ہیں، یا آئندہ کی جائیں گی، اس لئے ڈاکٹر صاحب کے ہر بیان پر نقد و نظر ضروری ہے، تاکہ ہمارا ذہن صاف رہے اور اعتذاری نفسیات کو تقویت نہ پہنچے۔

(۱) ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ "مستشرقین کی شکایات کے ادارے سے ناچیز کو بالکل اتفاق نہیں ....." ڈاکٹر صاحب کا ہر عقیدت مند ان سے یہ سوال کرنے کی جرأت کرے گا، کہ کیا مستشرقین کو اس کا حق ہے کہ وہ سال، دو سال یا تین برسوں میں دنیا کے کونہ کونہ میں اپنی کانفرنسیں منعقد کرتے رہیں، اسلام پر نشستیں کرکے نہایت دل آزار مقالات پڑھتے رہیں۔ اسلام کی اصلیت پر موشگافیاں کرکے دنیا کو بتاتے رہیں، کہ اسلام یہودیت اور مسیحیت کی بگڑی ہوئی شکل ہے، محمدؐ نبی کاذب تھے، قرآن کی تالیف کرکے دینی فضا کو مکدر کیا، وغیرہ وغیرہ۔ ان کے ہزاروں ادارے اس قسم کے جگر پاش، دل دوز و دل سوز مقالات شائع کرتے رہیں، ان کو اس کا حق ہے، لیکن ہمیں شکایت کا بھی حق نہیں، ہمیں اسکی تلقین کی جائے کہ ہم اپنے دین و کلچر کی توہین دیکھ کر بھی خاموش رہیں، مداہنت کی پالیسی پر عمل کریں۔

(۲) ڈاکٹر صاحب پھر فرماتے ہیں کہ "اگر ان سے مستشرقین کی اس کانفرنس کے انعقاد کا مشورہ لیا جاتا تو وہ ہرگز اس کا مشورہ نہیں دیتے"۔

یہ ڈاکٹر صاحب کی ذاتی رائے ہے اور ان کو اس کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار فرمائیں، لیکن ناچیز کی حقیر رائے میں "اسلام اور مستشرقین" کے زیر عنوان دار المصنفین کی یہ کانفرنس نہ صرف تاریخ ساز ہے بلکہ چودہ سو سالہ تاریخ میں ایک انقلابی موڑ بھی ہے، بشرطیکہ اس کو صحیح سمت سفر عطا کیا جائے، اور نشستند و گفتند و برخاستند کی آفت سے محفوظ رکھا جائے، اس کانفرنس کا انعقاد سیدی و مرشدی حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی صاحب مدظلہ کی دور رس نظر کا کرشمہ ہے، یہ ابتدائیہ ہے ایک انتہائیہ کا — تقریباً تین صدیوں سے استعمار نے ہمیں مغلوب رکھا اور ان کے طرفدار مستشرقین نے اسلام دشمن لٹریچر کا انبار جمع کرکے عالم اسلام کو اس کے اندر غرق کر دیا، ہم احساس کمتری کا شکار ہو گئے، ہمیں ایک ہی سبق پڑھایا گیا کہ اسلام عقل و دانش کا بدترین دشمن ہے، تہذیبوں کو برباد کیا، مصری، ایرانی، عراقی، شامی اور انڈس ویلی تہذیبوں کو فنا اور برباد کر دیا، تلوار کے زور سے پھیلا، اس کا اپنا کچھ نہیں ہے۔ اس نے سب کچھ قدیم یونان اور روم سے لیا، اور اب جدید یورپ کا خوشہ چین ہے، وغیرہ وغیرہ، دوسری عالمگیر جنگ کے بعد مغربی استعمار کی کمر ٹوٹی، اور سحر و کید کا یہ تودہ ڈھیر ہونے لگا، عالم اسلام میں دانشوروں کے قلم کی حرارت سے مغربی اسکالرشپ کا موم محل پگھلنے لگا، اب ہم اس مقام پر آگئے ہیں کہ ہم برملا اپنی کانفرنسوں اور بین الاقوامی اجتماعات یا اجلاسوں میں استشراقی آسیب کو اتار دیں۔ نئی اسلامی اسکالرشپ کی عمارت کھڑی کرنے سے پہلے ہمیں غلاظت سے جمی ہوئی عمارت کو منہدم کرنا ہوگا، تاکہ ہماری آئندہ نسل احساس کمتری کے دلدل سے نکل کر خود اعتمادی کی پر بہار فضا میں داخل ہو، اور پھر "افراد" کو نئی ریسرچ و تحقیق کی کیمونٹی کی حیثیت سے عالم میں نمودار ہو سکے، عالم اسلام میں پھر بہار علم پلٹ آئے، جیسے استعماریوں نے تین صدیوں

سے روک رکھا تھا، ہم "پدرم سلطان بود" کے نظریہ کی تائید نہیں کرتے، ہمارا مقصد امت مسلمہ کی نئی نسل کو احساس کمتری سے نجات دے کر نئے مستقبل کی تعمیر کا حوصلہ پیدا کرنا ہے، نئی عمارت کی بنیاد ریت ..... کے ڈھیر پر نہیں کھڑی کی جاتی ہے، اس کے لیے سنگین بنیاد کی ضرورت ہے۔

(۳) ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ "مستشرقین میں سے ہر فرد عناد و دشمنی نہیں رکھتا اور اکا دکا رکھتا ہے، وہ اس طرح کی کانفرنسوں اور شکایت ناموں سے شدید تر دشمنی دکھانے لگتا ہے، جیسا کہ کچھ دنوں سے یہاں نظر آرہا ہے ..."

اس کا جواب ایک مختصر سوال ہے! کاش ڈاکٹر صاحب چودہ سو سالہ تاریخ میں ایک مستشرق کی نشاندہی فرما دیتے، جو اسلام سے دشمنی اور عناد نہیں رکھتا ہے، ناچیز نے آپ کی کانفرنس کیلئے جو مقالہ پیش کیا اسکی طرف توجہ مبذول کرانا کافی ہوگا، ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ میں ہمیں ایک فرد ایسا نظر نہیں آیا جو اسلام دشمنی سے پاک ہو، ابھی زندہ مثال برنارڈ لوئس کی ہے جس نے قرآن کریم کا موازنہ جرمنی کے ایک وحشی رزمیہ سے کیا ہے، وہ رقمطراز ہے کہ "واگنر نے اسی رزمیہ [illegible] سے اپنی موسیقی یا اوپرا (OPERA) کی تخلیق کی" (ملاحظہ ہو "امریکن اسکالر"، شمارہ گرما ۱۹۷۹ء صفحہ ۳۴۳) قرآن کریم کو جرمنی کے وحشی رزم سے تشبیہ دینا کس دانش کا ثبوت ہے؟ برنارڈ لوئس اور اسی قبیل کے مستشرقین مغربی جامعات کے علمی اور تحقیقی اداروں کے سربراہ ہیں، یہ سب زہر پھیلانے میں مصروف ہیں، یہ بات سرے سے قابل قبول نہیں کہ "اکا دکا" دشمنی رکھتا ہے، دوسرا سوال یہ ہے کہ آخر "اکا دکا" جو دشمنی رکھتا ہے وہ اس قسم کے شکایت ناموں سے شدید دشمنی کیوں دکھانے لگتا ہے؟ اس کی دشمنی پر اس کانفرنس کا کیا اثر پڑے گا؟ آخر کچھ دنوں سے یہ کہرام یورپ میں کیوں مچا ہوا ہے؟ اگر مستشرقین مخلص ہیں تو انہیں کیا ڈر؟ چوں حساب پاک است از محاسبہ چہ باک؟ یہ کہرام و مرثیہ خود اس بات کی دلیل ہے یا اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ ہمارا موقف صحیح

ہے۔ مستشرقین کے دل میں چور ہے، وہ نہیں چاہتے کہ ان کی اسکالرشپ کی نقاب کشائی کی جائے منظم
اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں ان کے خلاف تہلکہ مچایا جائے، انھیں معلوم ہے کہ ان کے سحر کا زور
اب ٹوٹ رہا ہے، مشرق میں مغربی اسکالرشپ کے آسیب کو اتارنے کے لئے کانفرنسیں برپا کی جارہی
ہیں، انہیں خطرہ ہے کہ اگر خالص، طاہر و مطہر اسلامی لٹریچر کی افزائش ہوئی تو ان کے کھوٹے سکوں
کو نگاہیں پہچان لیں گی، اور خود ان کے حلیف اور طرفدار ان کا کیمپ چھوڑنے پر مجبور ہوں گے، چونکہ
توحید و تثلیث کا تصادم ازلی ہے اور عقیدہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ کا ٹکراؤ نظریۂ ابن اللہ کے ساتھ
ابدی ہے۔ اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ عالم مسیح کا کوئی فرد اس قسم کی کانفرنسوں کو پسندیدگی کی نظر
سے دیکھے، اور ہمارے اعلان کو پسند کرے کہ "اسلام اور علوم اسلامیہ کی تعبیر و تفسیر کا حق صرف
مسلمانوں کو ہے، دوسرے مذاہب والے اپنے تعصب کی بنا پر انصاف نہیں کر سکتے..."

ڈاکٹر صاحب کی یہ بات کہ "ہم اپنے بچوں کو ان ہی کے ہاں بھیجتے ہیں اور ان کے پرزہ کاغذ
(ڈگری کی سند) پر اتراتے ہیں، پھر انہی کی شکایت کریں، اخلاق تو اسکی اجازت نہیں دیتا"
ہمارے ننانوے فی صدی لڑکے سائنسی علوم کی تحصیل کے لئے مغربی جامعات میں جاتے ہیں،
جہاں عقائد کا ٹکراؤ کم ہے، مستشرقین کے خلاف ہماری کانفرنسیں اسی لئے منعقد کی جانے لگی ہیں کہ
ہمارے بچے مغربی پرزہ کاغذ پر اترانا چھوڑ دیں، اپنے شاندار مستقبل سے واقفیت حاصل کرکے نئی دنیا
میں وہ پھر عالم تازہ پیدا کریں اور علم و فضل کی وہ فضا پیدا کر سکیں کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے اساتذ
و طلبہ پھر بغداد، قاہرہ اور قیروان جاکر تحصیل علم پر اترائیں، یہ حقیقت ہے افسانہ نہیں کہ یورپ کے
علماء و فضلاء نقل میں جزدان دبا کر اندلس جایا کرتے تھے، اور اسلامی اسکالرز کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا
کرتے تھے، کیا تابناک ماضی کے احیاء کی آرزو معصیت ہے؟ پھر یہ منطق ہم کیسے قبول کر سکتے ہیں کہ چونکہ
ہمارے بچے مغربی جامعات و اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے یورپ جاتے ہیں۔ لہذا ان کو اس بات کی کھلی

اجازت ہو کہ وہ ان بچوں کے اسلاف کو، ان کے دین و پیغمبر کو، ان کی دینی والہامی کتاب قرآن کو
مسخ کرنے کی کوشش کریں، کیا اخلاق اس کی اجازت دیتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ آج یورپ
محیر العقول سائنسی ایجادات کے مرحلے سے گذر رہا ہے، اور ہم وہاں تک پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے،
لیکن پہنچنے کی آرزو، طفل تسلی اور خام خیالی سہی معصیت نہیں۔ یورپ ایک دن میں ان ترقیات
کو حاصل نہیں کر سکا، استشراقی اسکالرشپ کے اسی نعرہ نے کہ ہم نے سب کچھ یونان سے بھیک میں
لیا ہے، ہمیں مفلوج کر دیا ہے، اسلامی چراغ علم کو پھر فروزاں کرنے کے لئے خون جگر کی ضرورت
ہے، جو ان ہی کانفرنسوں کے ذریعہ ممکن ہے، ان کانفرنسوں میں ہماری مساعی ایک مربع کی شکل اختیار
کریں گی، یعنی (۱) استعماری افسون کا مداوا اور (۲) معذرتی نفسیات سے گلو خلاصی (۲) مستشرقین
کے زہر کا علاج (۳)، علوم اسلامیہ کا احیاء، اور (۴) اسلام، علوم اسلامیہ، تاریخ اسلام، عقائد
اسلام کی تشریح و تفسیر کا حق مستشرقین سے واپس لینا۔! ممکن ہے ہم اپنی حیات میں ان مساعی
کو بار آور ہوتے نہ دیکھ سکیں، لیکن ہماری آیندہ نسلیں ضرور دیکھ سکتی ہیں، اخلاق کا ہر اصول ہمیں
اس کی اجازت دیتا ہے کہ ہم ظالم کے ظلم کے خلاف آواز بلند کریں، اپنے حقوق کا تحفظ کریں، اور ماضی
کے احیا کی سعی کریں، مستشرقین اور اسلام کے زیر عنوان کانفرنسوں کے انعقاد کا مطلب ہرگز یہ
نہیں کہ ہم مستشرقین کے خلاف محاذ آرائی کر رہے ہیں یا طبل جنگ کا اعلان ہے، اس کا مقصد اپنے
دین اور ثقافت کا تحفظ ہے، قلم کے زہر کو کافور کرنا اور نظر کی جاندس یا پیلی کو دور کرنا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمان درست ہے کہ "مستشرقین مسلمان نہیں، ان سے توقع کہ وہ سو
فی صدی ہماری باتوں کی داد دیں، یہ عبث ہے، ان سے سو فی صدی تو کیا ایک فی صدی باتوں کی
داد کے ہم نہ تو بھوکے ہیں نہ خواہاں ہیں، ان کی داد نہ دینے سے توحید پر آنچ نہیں آئے گی، ممکن ہے
ان کو تثلیث کے عقیدے میں فرق آئے، "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" کا فیصلہ اٹل ہے، اور بحق بجا،

اس فارمولا پر ہمیں شرح صدر ہے، نہ تو اعظم گڈھ کی کانفرنس نے ان کو مسلم تصور کیا ہے، نہ ہی آیندہ کوئی کانفرنس اس کی توقع رکھتی ہے۔ یہ ہمیں اور سارے جگ کو معلوم ہے۔

(۴) دفاع :۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمان کہ "ان کے دین اور ان کی دنیا کے متعلق کیا ہم بھی مبالغہ آمیز شکایتیں اور تنقیدیں نہیں کرتے"؛ جواباً عرض ہے کہ اسلام کی پوری تاریخ میں مستشرقین جیسا کوئی منظم ادارہ وجود میں نہیں آیا جس نے دین مسیح پر منظم حملے کئے ہوں، اوّل تو حضرت مسیحؑ خود مسلمانوں کے پیغمبر تھے، لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ کا عقیدہ ہمیشہ کارفرما رہا، ہاں مختلف ادوار میں مختلف مسلم علماء نے مشنری زور کو توڑنے کے لئے ان مناظرات میں ضرور حصّہ لیا، جسکی دعوت خود مستشرقین نے دی، ہم میں سے بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ خود ہندوستان میں تمام مذہبی و مشنری امور کا سربراہ اعلیٰ خود وائسرائے ہند ہوا کرتا تھا، اسی کی نگرانی میں اشاعت دین مسیح کا اہتمام ہوا کرتا تھا، مالیہ کا نظم اور اہل ہند کو مسیح بنانے کی مہم میں مشورے کا مصدر اول وہی ہوا کرتا تھا، ان مواقع پر مسلمانوں نے دفاعی محاذ ضرور قائم کیا، اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ افریقہ میں، ایشیا، خاصکر انڈونیشیا میں اور خود ہندوستان و پاکستان میں دین مسیح کی اشاعت کس طرح ہوئی ہے یا ہو رہی ہے، تو ہم انگشت بدنداں رہ جائیں گے، کیا اس مسیحی جارحیت کے خلاف گلہ و شکوہ بھی جرم ہے؟ اور اپنے دین حنیف کے تحفظ کے لئے نعرہ بلند کرنا مبالغہ آمیزی ہے؟ یہ بات عبرت خیز ہے کہ برطانیۂ ہند کا وائسرائے دین مسیح کے اشاعتی ادارہ کی سربراہی پر فخر محسوس کرے، مگر آج ہم محض اسلام کا نام لیتے ہوئے اس لئے شرمائیں کہ ہم حقیقت پسند اور کوتاہ نظر نہ کہلانے لگیں، اگر عہد استعمار میں مناظرات کی تاریخ ہمارے سامنے ہو تو ڈاکٹر صاحب کے اعتراض پر ہمیں تردد نہ ہوگا،

(۵) مستشرقین کے اخلاص علمی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ "میرا تاثر یہ ہے کہ وہ عام طور پر عمداً اسلامی چیزوں پر اعتراض نہیں کرتے، وہ مخلص ہوتے ہیں، یعنی اپنے علم اور فہم کے مطابق تاثر لیتے ہیں اور بتلاتے ہیں، گالی گلوچ کے ساتھ نہیں"؛ تاریخی تجربہ اسکے برخلاف شہادت پیش کرتا ہے،

پندرہ صدیوں میں ان کے اخلاص علمی نے اس سے زیادہ ترقی نہیں کی کہ اسلام مسخ شدہ مذہب ہے، اور محمدؐ نبی کاذب ہیں، قرآن محمدؐ کی تالیف ہے۔ ان کی فہم و دانش نے اس سرحد سے ایک انچ آگے قدم نہیں بڑھایا، جہاں تک ان کی گالی گلوچ کا تعلق ہے، تو حقیقت یہ ہے کہ ڈیڑھ ہزار برسوں کی گالی گلوچ کو اگر یکجا کر دیا جائے، تو یہ مجموعہ چند جلدوں میں تو کیا ایک چھوٹی سی لائبریری میں بھی سما نہیں سکتا، ناچیز چند برسوں سے ان مغلظات کو یکجا کرنے میں مشغول ہے، کاش یہ پروجکٹ تکمیل کے مرحلہ تک پہنچ جائے، سوچنے کی بات ہے کہ مستشرقین آخر کسی دوسرے مذہب کے پیچھے کیوں نہیں پڑے؟ اس دنیا میں تو اور بھی مذاہب ہیں! بدھ مذہب ہے، ہندو دھرم ہے، چینی، جاپانی، افریقی مذاہب ہیں۔ مستشرقین جان جی دیکر آخر اسلام کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ اس لئے کہ اسلام محض عقائد کا فرسودہ مجموعہ نہیں، یہ ایک نظام حیات ہے، نظام فکر ہے، صدیوں کا تجربہ کردہ نظام ہے، اس کے اندر اپنی قوت و طاقت ہے، اسی لئے دنیا میں اگر کسی مذہب پر سب سے زیادہ حملہ ہو رہا ہے تو وہ اسلام ہے۔

اگر مستشرقین واقعی مخلص ہوتے تو وہ خود ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحقیقات و تالیفات پر یقین کر لیتے، یا کسی دوسرے مسلم اسکالر کی تحقیقات کو ہی تسلیم کر لیتے، انکار حدیث، انکار قرآن کے بجائے ان کو مذہب اسلام کی اساس قبول کر لیتے، اسلام کے خلاف محاذ آرائی اور اس کے نبی کی توہین اور کلام الٰہی کی بے حرمتی کے بجائے یا تو خاموش رہتے یا نرم لہجہ اختیار کرتے، یہ تشنیع اور عصبانی ہذیان جو مستشرقین کی وبائی بیماری رہی ہے، اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ مخلص نہیں۔ وہ عمداً اسلامی چیزوں پر اعتراض کرتے ہیں، اور کرتے رہیں گے۔

(۶) ناچیز کو حسرت ہی رہ گئی کہ وہ کسی ایک مستشرق کی ایسی کتاب پڑھتا جو گالی گلوچ، تبرّہ بازی، رکیک زبان اور چھچھورے اسلوب یا طرز نگارش سے پاک ہوتی، کاش ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کسی بھی مستشرق کی ایک کتاب کا حوالہ دیتے تو ہم سب اس کی طرف رجوع کر سکتے، گالی گلوچ کا

یہ حال ہے کہ برناڈ لوئس نے اپنی تازہ ترین تالیف (The Muslim Discovery of Europe) مطبوعہ نیویارک ۱۹۸۲ء (صفحات ۳۵۰) میں، اسلام اور اسلام قبول کرنے والے مسیحیوں کے خلاف جو رکاکت لسانی کا ثبوت دیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے، ۱۹۸۲ء کی لکھی ہوئی کتاب کے گالی گلوج کا مقابلہ ایک صدی قبل کی لکھی ہوئی کتاب سے کر لیجئے، کوئی فرق نظر نہیں آئے گا، وہی تبرہ بازی ہے اور وہی مغلظات ہیں۔ ہالینڈ کا معروف مستشرق جس کا نام آج بھی بڑے احترام کے ساتھ مستشرقین لیتے ہیں، ڈوزی (Dozy) تھا انہوں نے بھی سو سال قبل اپنی تالیف (History of Spanish Islam) میں اسپین میں فروغ اسلام اور ہسپانوی عیسائیوں کے مشرف باسلام ہونے پر وہی گالی گلوج استعمال کیا تھا جو ۱۹۸۲ء میں اس کے شاگرد رشید لوئس نے کیا ہے، زبان کی رکاکت اور توہین آمیز اسلوب نگارش دونوں کا طرۂ امتیاز ہے، عالم اسلام میں "مستشرقین" کی اصطلاح اب رسوائے زمانہ ہوتی چلی جا رہی ہے، اس کے معنی "اسلام دشمن ٹولی" کے ہیں، جس کا پیشہ اور مشن بلکہ رزق و روزی کا مدار ہی اسلام کے خلاف لکھنے اور لٹریچر فروخت کرنے پر ہے، اسی لئے اب مستشرقین نے اپنے آپ کو اسلامیسٹ (Islamicist) لکھنا شروع کیا ہے، تاکہ ان پر لفظ مستشرق کا اطلاق ہی نہ ہو، چنانچہ برناڈ لوئس نے بھی اپنی مذکورۂ بالا کتاب کے مقدمہ میں اپنے آپ کو اسی نئی اصطلاح سے یاد کیا ہے، یعنی یہی اب ان کا تخلص ہے، یہ شعر پرانا سہی، نتیجہ ہے اس گھبراہٹ، خوف اور اسلام دشمنی کا جس کے خلاف عالم اسلام کھڑا ہو چکا ہے، اور جس کے خلاف علیگڈھ کی کانفرنس منعقد کی گئی تھی، اور آئندہ بھی اسی قسم کی کانفرنسوں کا ہجوم ہوگا، ایک ملک میں نہیں سارے عالم اسلام میں ہوگا، مستشرقین کا بھرم کھلے گا ؎

قریب ہے یار، روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر

جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستین کا

ڈاکٹر صاحب مستشرقین کے اخلاص کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر خالص علمی انداز میں مستشرقین کو ان کی غلطیاں بتائی جائیں تو عام طور پر وہ فوراً مان لیتے ہیں، اس سلسلہ میں وہ نظائر بھی پیش کئے ہیں،

اپنے دعویٰ کی دلیل میں ڈاکٹر صاحب شاخت کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انقرہ میں ہونے والی سرخسی کے جشن کے موقع پر علمی مقالات پڑھے گئے، شاخت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنا مقالہ پیش کیا، شاخت کا مقالہ اغلاط سے بری نہ تھا، چنانچہ اس نے اپنے مقالہ کی اصلاح ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کی روشنی میں کی اور پھر طباعت کے لئے پیش کیا، یہ بیان درحقیقت ہمارے موقف کی تائید ہے، ہم یہی تو کہتے ہیں کہ مستشرقین کے ائمہ بھی مصادر اولیٰ تک نہیں جاتے، بلکہ محض اپنے متقدمین کی کتب تک ان کی رسائی ہے، اسی بنیاد پر سارا عالم ان کو سند جہاں تسلیم کر لیتا ہے، ہمارا دعویٰ یہی ہے کہ مستشرقین کا علم ناقص ہے، وہ مفروضات پر اپنی عمارت کھڑی کرکے خود ہی اس پر رنگ و روغن کر دیتے ہیں، بعض اوقات اصل مصادر کے انکشاف سے گھبرا کر وہ اپنے موقف کو اس لئے بدل دیتے ہیں کہ ان کی اسکالرشپ کی عظمت پر آنچ نہ آجائے، یہاں یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ یہ غلطیاں عمداً دیدہ و دانستہ تھیں یا سہواً لاعلمی کی بنا پر تھیں، یہ تو محض اتفاق کی بات تھی کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اس جشن میں موجود تھے اور انہوں نے اپنا مقالہ بھی پیش کیا، اگر ڈاکٹر صاحب نہ ہوتے اور اپنا مقالہ پیش نہ کیا ہوتا تو شاخت صاحب ہی سند تسلیم کر لئے جاتے، اور مصدر بھی بن جاتے، اب سوال یہ ہے کہ دنیا بھر کی کانفرنسوں میں جہاں مستشرقین اپنی ناقص تحقیقات (عمداً یا سہواً) پیش کرتے رہتے ہیں، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب یا ان کے پایہ کا مخلص عالم کیسے موجود ہو سکتا ہے، جو مستشرقین کی اصلاح کر سکے۔

ڈاکٹر صاحب نے مستشرقین کے اخلاص کا ذکر کیا ہے۔ یہ معاملہ بڑا نازک ہے، اخلاص کا تعلق قلب سے ہے، اور قلب کا علم صرف اللہ کو ہے، ہم اس پر کوئی فیصلہ صادر نہیں کر سکتے، ہم تو صرف داخلی اور خارجی شہادت کی حد تک اپنی رائے کے اظہار کے مجاز ہیں، اگر آنجہانی شاخت مخلص ہوتا تو تحریک انکار حدیث کے امام گولڈ زیہر کی امامت قبول کرنے کی بجائے حمید اللہ صاحب کی امامت قبول کرتا، اور احادیث کو مجموعۂ انتحال یا جعل سازی قرار نہ دیتا، اور قوانین اسلامیہ و شرعیہ سے متعلق احادیث آحاد کو دوسری صدی ہجری کی موضوعات قرار نہ دیتا، اور یہ نہ کہتا کہ احادیث کا بیشتر حصہ امام شافعیؒ کے بعد گڑھا گیا، جب اسلامی قانون سازی کی تحریک چلی اور قانون سازی کے لئے احادیث کی تائید کی ضرورت محسوس کی گئی۔ کون ہے جو ایسے اسکالر کو مخلص قرار دے گا؟ کیا یہی علامت اخلاص ہے؟ کیا کسی مذہب کے اساس کی بیخ کنی اسکالرشپ ہے؟

نظیر ثانی | ڈاکٹر صاحب مستشرقین کی صداقت و امانت علمی کی دوسری نظیر پیش کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ "اٹلی کے معروف مستشرق لیوی دیلا ویدا نے ذمیوں سے دگنی چنگی وصول کرنے کے موضوع پر جب ان کا (ڈاکٹر صاحب کا) مقالہ پڑھا تو انہیں ایک خط لکھا کہ " تمہاری دلیلوں کے سامنے تو کوئی یہودی ربائی بھی زبان نہیں کھول سکے گا"۔

اس کے جواب میں بھی ناچیز قرآنی موقف کو ترجیح دینے کے حق میں ہے، جواب خود ایک سوال میں مضمر ہے، کیا یہودی ربائی یا عیسائی پادری (علماء اہل کتاب) اسلام اور اسلامی تاریخ سے ناواقف تھے، یا ہیں؟ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ توحید کی امانت یعنی کتاب الٰہی (وحی نزول قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت وغیرہ) کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ یہ انتہائی بلیغ اشارہ ہے، انسان اپنے بچے کو بغیر اشتباہ کے فوراً پہچان لیتا ہے، خواہ وہ درجنوں بچوں کے جھرمٹ میں کھڑا ہو یا ان کے ساتھ کھیل رہا ہو، اسی طرح قرآن کو علمائے اہل کتاب درجنوں مذاہب اور عقائد کے درمیان

پہچان رہے تھے، کہ یہ من جانب اللہ ہے اور توحید کی امانت ہے، مگر پہچاننے کے باوجود کتمان حق پر کمربستہ تھے، اور ہنوز ہیں۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَھُمْ فَھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (انعام ۲۰)

خود اپنی کتابوں کی روشنی میں علمائے یہود و نصاریٰ ایک نبی کی آمد کے منتظر تھے، مگر اس ظہور قدسی کے بعد وہ انکار کرنے لگے، اور اس طرح اپنے آپ کو خسارہ میں ڈال دیا، اللہ نے ایسے لوگوں پر لعنت بھیجی اور اعلان کر دیا کہ " جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں، درانحالیکہ ہم انہیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لئے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے، اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں، البتہ جو اس روش سے باز آجائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں، اور جو کچھ چھپاتے تھے اسے بیان کرنے لگیں، ان کو میں معاف کر دوں گا اور میں بڑا درگذر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں"۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰهُ وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَیَّنُوْا فَاُولٰٓئِکَ اَتُوْبُ عَلَیْھِمْ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (بقرہ ۱۵۹-۱۶۰) اس آیت کریمہ میں علماء یہود پر سخت نقد ہے۔ علمائے یہود جس طرح اپنی کتاب یعنی احکام الٰہی کی اشاعت کرنے کے بجائے اس کو محض رہبون اور مذہبی پیشہ وروں کے ایک محدود حلقے میں مقید رکھتے تھے، اور یہودی عوام تک اسکو ہوا نہ لگنے دیتے تھے، اسی طرح قرآن کریم کو کلام الٰہی پہچانتے ہوئے بھی، اس کی مخالفت کرتے اور عوام کو اس کے خلاف بھڑکاتے تھے، اور ہنوز بھڑکا رہے ہیں۔

قرآن کا یہ بیان آج بھی ہماری ہدایت کے لئے کافی ہے، یعنی یہودی ربائی یا مسیحی پادری دل سے اسلام کی حقیقت کو پہچانتے ہیں وہ اسلامی تاریخ سے بھی ناواقف نہیں ہیں، وہ ذمیوں سے دگنی چنگی وصول کرنے کے اسباب سے بھی ناواقف نہیں، وہ سب کچھ جانتے ہیں مگر کتمان حق چونکہ ان کی فطرت

ثانیہ بن گئی ہے، اس لئے وہ حق کی مخالفت پر کمر بستہ ہیں، عوام کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ ناواقف
تھے یا ہیں تو یہ بات قابلِ قبول ہے، کیونکہ ہر مذہب کے عوام خود اپنے مذہب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور
اور علمائے مذاہب کی ہدایت پر انحصار کرتے ہیں، اس لئے یہودی اور مسیحی عوام کے بارے میں یہ کہا جائے
کہ وہ تاریخ اسلام کی تفصیلات سے ناواقف ہیں، یا ذمیوں کے بارے میں تفصیلات نہیں جانتے تو یہ
بات عقل میں آنے والی ہے، لیکن کسی ربانی یا پادری کے بارے میں کہنا قابل قبول نہیں۔

اگر یہ مفروضہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ ڈاکٹر صاحب کی پیش کردہ دلیلوں کے آگے کوئی ربانی
ذمیوں کے بارے میں زبان نہیں کھول سکتا، تو پھر اسی منطق کو مزید وسعت کیوں نہ دی جائے؟ آخر
ڈاکٹر صاحب کی دیگر تالیفات یا کتب (مثلاً قرآن، دی محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اسلامی تاریخ کے بہت سے
دوسرے گوشے) بھی دلائل کی روشنی میں ہی لکھی گئی ہیں، اگر ربانی ذمی کے معاملہ میں زبان نہیں کھول سکتا
ہے تو اسے اسلام کی صداقت میں ڈاکٹر صاحب کے پیش کردہ دلائل کے سامنے بھی زبان کھولنا نہیں چاہئے
کلام الٰہی یعنی قرآن کے انکار پر مصر نہیں ہونا چاہئے، نہ ہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی کاذب قرار دینا
چاہئے، نہ ہی اسلام کو یہودیت و مسیحیت کی مسخ شدہ صورت تصور کرنا چاہئے۔

اگر دلائل کی کوئی اہمیت ہوتی تو یہود و نصاریٰ ڈیڑھ ہزار برسوں سے اسلام کی بیخ کنی پر
کمربستہ نہ ہوتے، اور آج شرق اوسط میں صلیب کا نیا دور شروع نہ ہوتا، عیسائی اور یہودی دو ہزار
سال نفرت و قتل و کشت کے بعد اس طرح شیر و شکر (بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ) نہ ہوتے، اور حضرت
عیسیٰ کے قاتلین "یہودی کلیسا اور چرچ کے متولی نہ ہوتے" ؎

نزع کی حالت میں یہ تہذیب جوانمرگ　　شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی

اقبال کی یہ پیشین گوئی برحق ثابت ہوئی، گرچہ مرحوم خود اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھنے کیلئے
زندہ نہ رہے، بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ آج بعض جامعات میں دراساتِ علومِ مسیح

کے شعبہ جات کے اخراجات بھی یہودی تجوری سے ادا کئے جاتے ہیں، مسیحی اساتذہ کی تنخواہیں تک کلیسا
کے یہودی متولی ادا کرتے ہیں۔ این چہ بوالعجبیست؟

مراسلہ کے آخر میں ڈاکٹر صاحب مشورہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "ان کی چیزوں کو کھلے دل
سے پڑھ کر ان غلط فہمیوں کو خالص علمی انداز میں دور کریں، ہو سکے تو ان کا نام بھی نہ لیں، زیر بحث
مسئلہ کو اس طرح پیش کریں کہ اعتراض خود ہی دور ہو جائے۔"

یہ مشورہ سر آنکھوں پر! مگر یہ محض نظریہ ہے، عملی طور پر مشکل ہے، کون قاری ایسا ہوگا جو کھلے
دل سے ان کی تالیفات کو نہیں پڑھتا ہے، جب گالی گلوچ مغلظات اور رکاکت شروع ہوتی ہے
تو دل آزاری ہوتی ہے، کیا خود ڈاکٹر صاحب نے یا دیگر علمائے اسلام نے خالص علمی انداز میں ان کی غلطیوں
کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی ہے؟ کیا ضخیم سے ضخیم کتابیں نہیں لکھی گئیں؟ کیا ان تالیفات نے مستشرقین
کی غلطیوں کو دور کر دیا؟ کیا وہ کلاسیکی اعتراضات جو دمشق کے جان (د سنہ یا ۷۴۹ء) نے اٹھائے
تھے، برنارڈ لوئس (حی القائم) کے دور یعنی سن ۱۹۸۳ء تک علیٰ حالہ قائم نہیں ہیں؟ (جن کی طرف
ناچیز نے اپنے طویل مقالہ میں بھی بار بار اشارات کئے ہیں) نام لینا اور نہ لینا دونوں بے معنی ہیں، اس سے
کوئی فرق نہیں پڑتا، حقیقت الحقائق تو یہ ہے کہ اَلْحَقُّ مُرٌّ (حق تلخ ہے)
اور پھر یہ علمی بددیانتی ہوگی کہ نام کو مخفی رکھ کر کسی پر جرح و نقد کیا جائے، جب ہمارا موقف صحیح
ہے، تو ڈرنے کی کیا ضرورت ؎

دلیر آمدی سعدیا در سخن　　چو تیغت بدست است فتحے بکن
بگو آنچہ دانی کہ حق گفتہ بہ　　نہ رشوت ستاں و نہ رشوت بدہ

بات بڑھتی جا رہی ہے لیکن ناچیز جناب سے اس کی اجازت چاہے گا کہ اس ضمن میں ایک ذاتی نظیر
بھی پیش کرے، انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کی مقبولیت

سے کون واقف نہیں، بلکہ یہ علوم کے میدان میں عالمی سند کی حیثیت رکھتے ہیں، کوئی مقالہ اسلام، اسلامی تاریخ و تہذیب سے متعلق پڑھ جائیے، دل آزاری کے سوا کچھ نہ ملے گا، آج سے پورے بیس سال قبل کا ذکر ہے کہ ہیچمدان نے عربی زبان و ادب میں فن توشیح پر ایک ریسرچ مقالہ لکھا، مذکورہ بالا انسائیکلو پیڈیا نے تمام عالمی موشح فن پاروں کا ذکر کیا مگر عربی کا نام تک نہیں لیا، حالانکہ ناچیز کی تحقیق کے مطابق دنیا کے کسی ادب میں توشیحی عمل پختگی کی اس منزل تک نہیں پہنچ سکا جہاں عربی کا موشح پہنچا ہے، (ملاحظہ ہو عنوان الشرف مؤلفہ شرف الدین اسمٰعیل المقری (متوفی ۱۴۳۳ء) اور التحفۃ السنیۃ مؤلفہ عبداللہ آفندی الوصاف (متوفی ۱۸۵۳ء) یہ تحقیق یوں شروع ہوئی کہ جدید کمپیوٹر کا نظام اسی فن سے متاثر نظر آتا ہے (یہ تحقیق ہنوز ناتمام ہے اور جاری ہے) ناچیز کا یہ مقالہ سندھ یونیورسٹی کے ریسرچ جرنل (جلد ۳-۱۹۶۳، صفحات ۲۷ تا ۹۱) میں شائع ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں ناچیز نے اس مقالہ کو امریکن اورینٹل کانفرنس کے ۱۷۹ ویں سالانہ اجلاس منعقدہ نیویارک میں پیش کیا، سامعین یہ باور کرنے کو تیار نہ تھے کہ عربوں نے ایسا سحر آمیز کام کیا ہے، اس سلسلے میں ناچیز تمام عبرانی اور سنسکرت کے علماء سے ملا کہ آیا ایسا کوئی نمونہ قدیم کتابوں میں موجود ہے، جواب نفی میں ملا، آخر میں ناچیز دنیا کے معروف امریکی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر سے ملا جو صوبہ مساچوسٹ میں واقع ہے اور M.I.T کے نام سے معروف ہے۔ عربی موشح کا نمونہ دکھایا، وہ بھی حیران اور انگشت بدنداں تھا، ناچیز نے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایڈیٹر کو مقالہ کی کاپی ارسال کر دی اور عند الملاقات اس سے شکایت بھی کی، کہ علوم عربیہ اسلامیہ کے ساتھ آخر سوتیلی ماں کا سلوک کیوں ہے، اور کب تک جاری رہے گا؟ مدیر موصوف نے فوری جواب دیا اور لکھا کہ انسائیکلوپیڈیا کی آئندہ اڈیشن میں یہ معلومات استعمال کی جائیں گی، آج اٹھارہ سال ہو گئے لیکن انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ Acrostics میں عربی یا اسلامی Acrostics کا ذکر کہیں نہیں آیا، آپ خود فیصلہ کریں کہ "غلط فہمیوں کا علمی انداز میں دور کرنا کیا

معنی رکھتا ہے:" یہ مقالہ ناچیز کی تازہ تالیف دی ڈائنامکس آف اسلام، جامعہ ڈربن ۱۹۸۲ء (صفحات ۲۴۵-۲۶۱) میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

دوسری عالمی جنگ (۱۹۴۵ء) کے خاتمہ اور استعمار کے زوال کے بعد عالم اسلام کی آزادی نے اسلام کی نشاۃ ثانیہ یا نہضہ کی لہر پھونک دی ہے، علوم و معارف کے میدان میں نشاطیت کی نئی فضا بلکہ بہار آدی ہے، جسے استعمار نے کچل دیا تھا، ضرورت ہے کہ مستشرقین کی تحقیقات کا احاطہ کیا جائے، اور اس سے جو غلط فہمیاں اب تک پیدا ہو چکی ہیں ان کا ازالہ بھی کیا جائے، صالح علمی فضا کے لئے یہ ضروری ہے، بدقسمتی سے ہم نے ہمارے علما اور فضلا نے بھی مستشرقین کی تحقیقات پر اعتماد کلی کر کے نقصان اٹھایا ہے، ضرورت ہے کہ اس خسارہ کی تلافی جلد از جلد کی جائے، یہاں پر ایک نظیر کا پیش کرنا لازمی ہے۔

ابن سعد (متوفی ۲۳۱ھ/۸۴۵ء) کی طبقات الکبریٰ علمائے شرق و غرب سبھوں کے لئے مصدر اول کی حیثیت رکھتی ہے، یورپ میں اس کے کئی کئی اڈیشن شائع ہوئے، اس میں مکاتیب نبویہ ص کا بھی ایک حصہ ہے، ابن سعد کے جرمن اڈیٹر نے مکاتیب کے متن کی قرأت میں کافی غلطیاں کی ہیں، اسپرنگر نے ابن سعد کے مجموعہ مکاتیب کو علاحدہ کتابی شکل میں جمع کیا ہے، اس نے بھی قرأت میں غلطیاں کی ہیں، یہی حال اٹلی کے مستشرق کیتانی کا ہے، ہم عصر مسلم علماء میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے مکاتیب نبوی کی سیاسی اہمیت پر سب سے پہلے توجہ مبذول کرائی، دوسرے ایرانی عالم علی حسین نے اس کی طرف توجہ کی، اول الذکر نے مجموعہ "الوثائق السیاسیۃ" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر خلیفہ چہارم تک کے کئی سو مکاتیب جمع کر دیئے ہیں، آخر الذکر نے مکاتیب نبویہ کا مجموعہ دو جلدوں میں شائع کرایا ہے، ان علماء میں سے کسی نے بھی متن کی صحت یا مقارنہ اور مقابلہ کا اہتمام نہیں کیا، اور یہی وجہ ہے کہ ان مکاتیب میں متن کے اغلاط موجود ہیں، شاید اسی لئے کہ انہوں نے مستشرقین پر اعتماد کلی کر کے ان کو قبول کر لیا، ۱۹۷۴ء میں جب ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو ناچیز نے ان کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی، ڈاکٹر صاحب نے

فرمایا کہ ان کا مقصد اس وقت محض منتشر مکاتیب کو حتی الامکان یکجا کرنا تھا، ان کی تحلیل و تفرید کا وقت تھا، نہ ہی وہ اسکیم کا حصہ تھا، یہ بعد کے اسکالرز کا کام ہے کہ وہ تصحیح کا اہتمام کریں (اس واقعہ کا ذکر "پاکستان میں فروغ عربی" (جامعہ کراچی ۱۹۷۵ء، صفحات ۷۷ تا ۷۹) میں موجود ہے)

اسلام کا مسلمہ اصول "خذ ما صفا ودع ما کدر" ہے، مستشرقین کے معاملہ میں بھی اس اصول پر عمل کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا، اگر ان کا کوئی کام آج کی بدلی ہوئی مذہبی رواداری کی فضا میں قابل قبول ہے یا قابل تحسین ہے تو اس کی تحسین میں قباحت نہیں، حکمت مومن کی گمشدہ متاع ہے، لیکن یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ عقائد اور دینیات میں کوئی انصاف ممکن ہی نہیں ہے، یہ خام خیالی ہے، اور طفل تسلی بھی، البتہ ڈکشنری اور فہارس و معاجم میں ان کے کام لائق ستائش ہیں۔

گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے مستشرقین کے چند محاسن کا ذکر ضروری ہے، جو محض ذاتی تجربات پر مبنی ہیں، مستشرقین نامی مخلوق کا نام ناچیز نے سب سے پہلے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ میں طالب علمی کے ابتدائی دور (۱۹۴۲ء ۴۳ء) میں سنا تھا، پھر دار العلوم ندوۃ العلماء کی طالبعلمی کے دوران اس مخلوق کی شکل و صورت ابھر کر زیادہ واضح صورت میں سامنے آئی، جب علامہ شبلیؒ کی تالیفات پر نظر پڑی، یا استاذی الجلیل حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحریرات و تقریرات نظر سے گذریں، بڑی تمنا تھی کہ اس مخلوق سے ملاقات ہو تو پوچھوں کہ آخر وہ اسلام کے دشمن کیوں ہیں؟ بڑا معصوم سا طفلانہ سوال تھا، اس کا انتظار رہا، حسن اتفاق کہئے کہ جامعہ سندھ میں ۱۹۶۲ء میں پہلی بار کیمبرج یونیورسٹی کے مڈل ایسٹ سنٹر کے ڈائرکٹر آر۔ بی۔ سارجنٹ صاحب سے ملاقات ہوئی جو شیخ الجامعہ رضی الدین صدیقی صاحب کی دعوت پر تشریف لائے ہوئے تھے۔ رابطہ صرف ملاقات پر ختم نہیں ہوا، بلکہ اس سے آگے بھی بڑھا، شیخ الجامعہ نے ناچیز کو مامور کیا کہ سندھ کے آثار قدیمہ، مساجد و معابد وغیرہ کی سیاحت میں ناچیز بھی ڈاکٹر سارجنٹ کی معیت میں رہے، نیز کراچی کے علماء اور اسکالرز سے ملاقات

کے بعد مطار تک رفاقت جاری رکھے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ ایک معروف مستشرق کو یمین ویسار سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا، اور یہ تعلق آج تک قائم ہے، تقریباً بیس (۲۰) بائیس (۲۲) سالوں سے عالمی مستشرقین سے ربط رہا، ان میں سے اکثر ناچیز کے استاذ بھی تھے، کچھ رفیق تھے اور کچھ مشیر بھی، انہی ذاتی تعلقات کی بنیاد پر چند محاسن جو انسانی اخلاق کا کلس ہیں، ذکر ضروری ہے، ہم نے ان میں ایسے انسانی صفات دیکھے ہیں جو ہمارے اسکالرز میں موجود نہیں۔ مثال کے طور پر اگر ان سے کسی قسم کی معلومات حاصل کی جائیں، کوئی مسودہ یا مخطوطہ طلب کیا جائے، یا کسی تحقیق کے بارے میں معلومات طلب کی جائیں تو وہ اس میں چست نظر آتے ہیں، ہمارے علماء اس میں اکثر سست ہیں، کسی بڑے سے بڑے مستشرق کو بھی خط لکھئے وہ ہفتہ عشرہ کے اندر جواب مثبت یا منفی میں ضرور دیگا، ہمارے علماء الا ماشاء اللہ، اس کے عادی ہی نہیں، یا تو وہ خط پڑھ کر پھینک دیتے ہیں، یا ان کے پاس جواب کا وقت نہیں، ناچیز پورے اعتماد کے ساتھ عرض کر سکتا ہے کہ اس نے چوٹی کے مستشرقین سے ریسرچ و تحقیق کے سلسلہ میں مراسلات کئے، اور جوابات پائے، مگر جامعہ ازہر جیسی مایۂ ناز دانش گاہ کے ڈاکٹر کو بیسوں خط لکھا، جواب تو کجا خط کی رسید تک نہیں ملی، عرب ممالک ہوں یا ایشیائی اور افریقی مسلم ممالک ہر جگہ یہی حال ہے، علمی تعاون کی کمی ہے، ہمارے علماء میں نخوت کی کثرت ہے، جو وبائی مرض کی حیثیت رکھتی ہے، مستشرقین کی اسلام دشمنی اپنی جگہ پر، مگر اخلاقی قدریں اپنی جگہ پر ہیں، ہم آخر الذکر حصے کے معترف ہیں، اور داد تحسین دیئے بغیر رہ بھی نہیں سکتے، ہمارے ہاں جو اسکالرز یَمْشُوْنَ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا کے مریض ہیں وہ در اصل علم کی اعلیٰ منزلوں تک نہیں پہنچ سکے ہیں، ورنہ ہمارے ہاں بھی اخلاص و انکساری کے پیکر فرشتوں سے کم نہیں، مرشدی حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی کی مثال شاید اسی سلسلہ میں کافی ہو۔

والسلام

دعاگو دعا جو، خادم سید حبیب الحق ندوی

(۲)

کلکتہ
۲۳ جون سنہ ۸۳ء

مکرم محترم صباح الدین صاحب. السلام علیکم

مزاج گرامی۔ سید حبیب الحق صاحب ندوی کا مقالہ "اسلام اور مستشرقین" ایک منے انداز سے پیش کیا گیا ہے، اور بادۂ کہنہ در جام نو کے کیف و سرور کا حامل ہے، لائق مقالہ نگار مبارکباد کے مستحق ہیں،

محترم حمید اللہ صاحب کے خط مطبوعہ معارف مئی سنہ ۱۹۸۳ء پر اظہار خیال کی اجازت چاہتا ہوں،

محترم حمید اللہ صاحب کو مستشرقین کے ادارے کے قیام سے اتفاق نہیں، لیکن اس ناچیز کا یہ خیال ہے، کہ بیشتر حضرات کو ان کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہوگا، کہ نفاق و نزاع پھیلانے والے منافقین اور کاذبین کے باب کذب و افترا کا سدّ باب اور ان کے انسداد کی کوششیں نہ کی جائیں، میں جہاں تک سمجھتا ہوں مستشرقین کے اس ادارے کا قیام شکوہ شکایات اور اعتراضات کے لئے نہیں جواب شکوہ و شکایات اور دفاع اعتراضات و الزامات کے لئے ہے، اس زہر کا تریاق فراہم کرنے کے لئے ہے جو ان کی بدولت نہ صرف مسلم بلکہ غیر مسلم طبقہ کے دلوں، دماغوں اور ذہنوں میں پھیل رہا ہے۔

حمید اللہ صاحب کا خیال ہے کہ ان میں ہر فرد بیشہ ور عناد اور دشمنی نہیں رکھتا، یہاں اس فرد یا افراد کی بات ہی نہیں ہے جو بغض و عناد نہیں رکھتے، بات صرف ان ہی لوگوں کی ہے جو عناد رکھتے ہیں اور فتنہ، فساد پھیلاتے ہیں۔ اگر کذب و افترا پردازی، فتنہ انگیزی، فتنہ گری اور دروغ گوئی کی روک تھام اخلاق کے ناطے نہ کی جائے، اور اسے بے لگام چھوڑ دیا جائے، تو نتیجہ ظاہر ہے، زہر بنانے والے پیشہ ور ہوں یا غیر پیشہ ور، زہر کا اثر اور زہر کا عمل دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوگا، جہاں تک اکاد کا کی بات کا تعلق ہے، صلیبی جنگوں کے بعد سے لے کر آج تک کی صدیوں میں یہ تعداد بھی صدہا کی ہوگی، اور عمرو عیار کی زنبیل کی طرح ختم ہونے میں نہیں آئے گی۔ مولانا عتیق الرحمن سنبھلی جن کا مستقل قیام برطانیہ

میں ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں" برطانیہ، ۹ فیصدی غیر مسلم اکثریت کا ملک ہے، غیر مسلم اکثریت بھی وہ جس کی اسلام دشمنی اور کم سے کم بیزاری یا بیگانگی مشہور و مسلّم ہے"؛ ہاں اکا دکا یعنی ایک دو فیصدی ڈیون پورٹ کی طرح صرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے جسارت سے ایمانداری کے ساتھ شروع سے آخر تک سچائی اور حقیقت بیانی سے کام لیا ہے، اور اپنے ہم عصر اور پیشہ ور کی دھاندلی بازی اور دروغ گوئی پر اظہار ندامت و شرمندگی کیا ہے، اور ان کی غلطیوں کے لئے خود معافی کے خواستگار ہوئے ہیں، ہم ان کی قدر و منزلت کرتے ہیں، عزت و احترام کرتے ہیں، ان کے ناموں، ان کے کارناموں کا ذکر کرتے ہیں، انہیں سراہتے ہیں، سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں،

یہ درست ہے کہ ہم اپنے بچوں کو ان کے ہاں بھیجتے ہیں، صرف ڈاکٹری کی سند ہی نہیں، اور بھی ہر طرح کے علوم کی سند ان سے حاصل کرتے ہیں، صرف یہی نہیں، لاکھوں مسلمان ان کے ملکوں میں آباد ہیں، وہاں روزی کماتے ہیں، روزگار کرتے ہیں، ان کے اخلاق، ان کے انصاف، ان کی فراخدلی اور حوصلہ افزائی سے متاثر ہیں، اور ان کی خوبیوں کے معترف بھی ہیں، لیکن ہماری شکایت ان اداروں، ان ملکوں، ان حکومتوں، ان حکمرانوں اور ان کے باشندوں سے نہیں ہے، صرف ان ہی لوگوں سے ہے، جن کی بے انصافی، تنگ دلی، تنگ نظری اور ہٹ دھرمی ہم سے ہمارے ایمان کی متاع بے بہا چھینے لیتی ہے، اس میں وسوسے ڈالتی ہے، میں عرض کردوں گا وہاں کے بسنے والے، وہاں کے اداروں میں ان سے علم حاصل کرنے والے، وہاں روزی پیدا کرنے والے کے کسی گھر میں اگر وہاں کا کوئی باشندہ ڈاکہ زنی کرتا ہے، یا اس کا خون کرتا ہے، تو کیا دنیا کا کوئی اخلاقی تقاضا اور قانونی ضابطہ اسکی اجازت دیگا، کہ اس سے درگذر کیا جائے، یہ تو پھر دنیاوی مال و متاع سے بھی زیادہ اعتقادات پر ڈاکہ اور ایمان کا خون ہے، اسلام کے خلاف مستشرقین یا غیر مستشرقین کے ایسے لٹریچر کا تسلسل برقرار ہے، جس میں جھوٹ کی پوٹ اور ان کے دل کی کھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اور صرف ہم ہی

ان سے علم کے فائدے حاصل نہیں کرتے، کم و بیش وہ بھی حاصل کرتے ہیں، نہ معلوم کتنے مستشرقین ہونگے
جنہوں نے اسلامی مفکرین، محققین، مؤرخین اور محدثین کے علمی خزانوں سے فائدہ اٹھایا ہے، ان کے نام اور
تفصیل طوالت کا باعث ہوگی، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے موقف سے نہیں ہٹے۔

اس وقت یہاں صورت حال یہ ہے کہ اسلام چاروں طرف سے تنقید و تنقیص کا نشانہ بنا ہوا ہے،
کوئی قرآن شریف کے معانی اپنے حساب سے نکال کر ان پر اعتراضات کرتا ہے، کوئی اس کے معانی سے اپنا نقطہ
نظر ثابت کرتا ہے، کوئی اسلام کو جاہلیت کا مذہب بتاتا ہے، کوئی مسلم پرسنل لا بدلنے کا مشورہ دیتا ہے، کوئی
حدیث و فقہ میں فی نکالتا ہے، کوئی عورت کا درجہ اسلام میں نہایت گرا ہوا لونڈی کی طرح بتاتا ہے، غرض
جتنے منہ اتنی باتیں، اور یہ سب باتیں بڑے بڑے اخباروں میں لکھی جاتی ہیں، کمال تو یہ ہے، بہت سے لکھنے
والے بات اپنے مذہب کی کہتے ہیں، ساتھ ہی اسلام کو بھی گھسیٹ لیتے ہیں، اپنا گھر چھوڑ کر دوسروں کے
گھر میں جھانکنا شروع کر دیتے ہیں۔

حال ہی میں یہاں کے ایک بڑے مشہور انگریزی اخبار ٹیلیگراف میں مس تولین سنگھ کا آرٹیکل
"Why I am ashamed to be a Sikh" ۸ر مئی ۱۹۸۳ء کو
شائع ہوا تھا، وہ بات اپنے مذہب، اپنے گردوارہ کی کرتی ہیں، لیکن دوسرے مذاہب پر اپنی برتری
اور دوسروں کی عیب جوئی کرتے ہوئے اسلام پر بھی ایک ریمارک پاس کرتی چلی جاتی ہیں، وہ کہتی ہیں سکھ
ازم میں اسلام کا اندھا جوش و خروش نہیں ہے، لیکن انہیں نہیں معلوم کہ گرنتھ کے آخر میں بابا فرید الدین
گنج شکر کے کلام کا جو حصہ شامل ہے، اور وہ "فرید آکھیا۔ فرید آکھیا۔" (فرید نے کہا۔ فرید نے کہا) ان
کے فرمودات سے پر ہے، بابا فرید الدین گنج شکرؒ اسی اسلام کے مشہور صوفی بزرگ اور اسی اسلام کے ایک
ستون ہیں، جسے وہ اندھے جوش و خروش کا حامل بتاتی ہیں، اسلام اور مسلمانوں کو طرح طرح سے مطعون
کرنے، ان میں احساس کمتری پیدا کرنے اور ان کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے قلم بھی کچھ کم روان دوان

نہیں ہیں،
حال ہی میں انگریزی میں ایک کتاب اسلامی تصوف پر شائع ہوئی ہے، یہ ایک غیر مسلم کی لکھی ہوئی
ہے، جو اردو کے لکھنے والے بھی ہیں، اس کتاب میں یہ صاحب وہی سب باتیں کہتے ہیں، جو مستشرقین تصوف
کے بارے میں کہتے چلے آئے ہیں، کہ تصوف دوسرے مختلف مذاہب سے لیا گیا ہے، اور وہ ان مستشرقین کے حوالے
بھی دیتے ہیں، یہ لوگ غیر مستشرق غیر مسلم ہیں، لیکن ان کے علم کا ماخذ، ان کی معلومات کا منبع مستشرقین ہی
ہیں۔ صرف غیر مسلم ہی نہیں، اکثر مسلم حضرات بھی ان ہی سے متاثر ہو کر اپنے تاثرات سے اسلام و قرآن پاک کے
خلاف اپنی تنقیدات و اعتراضات کی خرافات کا زہر گھولتے رہتے ہیں۔

حمید اللہ صاحب آگے فرماتے ہیں "وہ مسلمان نہیں ہیں، ان سے توقع کرنا کہ وہ سَو فیصدی ہماری باتوں
کی داد دیں، یہ عبث ہے، اور ان کے دین اور ان کی دنیا کے متعلق کیا ہم بھی مبالغہ آمیز شکایتیں اور تنقیدیں نہیں
کرتے؟" حمید اللہ صاحب کا فرمانا بالکل بجا اور درست ہے، وہ مسلمان نہیں ہیں، لیکن ہم ان سے کب توقع کرتے
ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ سَو فیصدی ہماری باتوں کی داد دیں، ہم تو یہ کہتے ہیں کہ ایسی داد وہ ایک فیصدی بھی
نہ دیں تو بہتر ہے، جس کے پردے میں بیدادی بیداد ہو، ان کے دین اور ان کی دنیا سے متعلق ہماری شکایتیں مبالغہ
آمیز اور تنقیدیں ضرور ہوتی ہونگی، لیکن آٹے میں نمک اور نمک میں آٹے کا سوال ہے، پھر ہمارے یہاں ایسے
باقاعدہ منضبط ادارے اور آرگنائزیشن کہاں ہیں، جو ان کے ہاں اسی کام کے لئے وقف ہیں، علاوہ ازیں
ہماری شکایتیں اور تنقیدیں نتھو خیرا اور ہر ایرے غیرے کے بس کی بات نہیں۔ یہ کام اور خدمت صرف اہل
علم اور علما ہی بجا لاتے ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایسی تنقید، ایسی شکایت تو نہ کرتے ہوں گے، ایسی ہٹ
دھرمی اور جھوٹ سے تو کام نہ لیتے ہوں گے۔ کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے پیغمبر ہی نہ تھے، جیسا کہ بہت سے مستشرقین
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری پیغمبر کیا پیغمبر ہی نہیں کہتے، بلکہ ایک ریفارمر یا عیسائیت سے کچھ لے لوا کر،
پادریوں سے کچھ سیکھ سکھا کر اس میں کچھ ترمیم و تنسیخ کرنے کے بعد ایک نیا دین گھڑ لینے کی عجیب و غریب کہانیاں

کرتے رہتے ہیں، اور ان کو درست ثابت کرنے کے لئے زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ قلابے ملاتے ملاتے وہ خوب خوب ایسی ایسی قلابازیاں بھی کھاتے ہیں کہ ان کے منھ سے کہیں کہیں عالم حیرت میں اور کبھی کبھی عالم مجبوری میں حرف حق نکل ہی جاتا ہے، اور ہماری وسیع القلبی کا یہ عالم ہے کہ اس حرف حق کو جگہ جگہ موتیوں کی طرح چن لیتے ہیں۔ اور ان کے نام کے حوالوں کے ساتھ دیدیتے ہیں، اور یہ ذکر بھی نہیں کرتے کہ ان کے اس خیر کے ساتھ شر بھی شامل ہے۔

جہاں تک حمید اللہ صاحب کے ذاتی تاثر کا تعلق ہے، جس کی مثالیں انہوں نے دی ہیں، بہر حال مستثنیات ہر معاملہ میں ہوتی ہیں، انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ وہ عام طور پر عمداً اسلامی چیزوں پر اعتراض نہیں کرتے، جب کہ پوپ پال ششم نے یہ تسلیم کرلیا کہ یہ کام عمداً، ارادتاً، باضابطہ ہوتا رہا ہے، اور ہوتا ہے۔ اور اس پر اظہار افسوس بھی کیا ہے۔

حمید اللہ صاحب آخر میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ "ان کی چیزوں کو کھلے دل سے پڑھ کر ان کی غلط فہمیوں کو خالص علمی انداز میں دور کریں"۔ ان کا فرمانا بالکل بجا اور درست ہے، ہر شخص کو اس سے اتفاق ہوگا۔ وہ آگے فرماتے ہیں "ہوسکے تو ان کا نام بھی نہ لے کر زیر بحث مسئلہ کو اس طرح پیش کریں کہ اعتراض خود بخود دور ہوجائے"۔

تریاق کے نام پر زہر بنانے والوں، سچ کے پردے میں جھوٹ کی اشاعت کرنے والوں یا علانیہ زہر کی تجارت اور جھوٹ کی تبلیغ کرنے والوں کے نام کی نشان دہی نہ کی جائے تو ان کا کاروبار تو خوب چلتا رہے گا، اور ناواقف نادانستگی میں ان کا شکار ان کا نشانہ بنتے ہی رہیں گے۔ اگر ان کے نام کی نشان دہی نہ ہوتی تو جان سے لے کر دانتے، دانتے سے لے کر جارج سیل، سیل سے لے کر منٹگمری، اور منٹگمری سے لیکر جان لیفن تک اور اس سے آگے نہ معلوم کتنے ناموں سے آج کون واقف ہوتا، آج کل تو مہلک اجزا کی حامل دواؤں پر بھی بڑی سرخی سے زہر لکھ دیا جاتا ہے، تاکہ لوگ اس سے ہوشیار اور محتاط رہیں۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی مورخ چنگیز و ہلاکو کی فتوحات اور ان کی خونریزی کی تاریخ لکھے لیکن ان کے نام نہ لکھے، اسپین میں مسلمانوں پر ازابیلا کی سفاکی، ظلم اور زیادتی کی داستان لکھے اور اسکا نام تک نہ لے، دنیا کی کوئی تاریخ خواہ وہ سیاسی ہو یا مذہبی، ثقافتی ہو یا معاشرتی، بے نام ونشان نہ مکمل ہوتی ہے، نہ مستند ہوتی ہے اور نہ معتبر ہوتی ہے۔

میں جہاں تک سمجھتا ہوں، مستشرقین کے اس ادارے کا قیام مرض کو بڑھانے، پھیلانے کے لئے نہیں مرض کی صحت و شفا کے لئے ہوگا، اس کا مقصد کسی پر کیچڑ اچھالنا نہیں ہوگا، کیونکہ کیچڑ کو کیچڑ سے نہیں دھویا جاسکتا، بلکہ اس کیچڑ کو صاف کردینا ہوگا، جو اسلام اور مسلمانوں پر اچھالی جاتی ہے، تاکہ حقائق دنیا پر منکشف ہوتے رہیں، اور وہ آئینے صاف ہوتے رہیں، جن کو مخالفین اپنی اڑائی ہوئی دھول اور گرد و غبار سے آلودہ اور دھندلا کردینا اور ان کی آب و تاب کو ختم کردینا چاہتے ہیں۔

محترم حمید اللہ صاحب کی شخصیت قابل احترام ہے، ان کی دینی اور علمی خدمات قابل ستائش ہیں، ان کا مستقل قیام پیرس میں ہے، ان کے تعلقات اور ان کا ماحول جس میں وہ رہتے ہیں ایسے ہی تاثرات کا مقتضی ہوسکتا ہے، جس کا اظہار انہوں نے فرمایا ہے، لیکن تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے، اور ان کے خیال کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے، جس کا اظہار راقم الحروف نے کیا ہے۔

ادبیات

غزل

(از جناب عروج زیدی صاحب، رامپور)

قدسیوں میں دھوم تھی کل جس کی ہفت افلاک پر
شامتِ اعمال سے ہے آج فرشِ خاک پر

زیبِ داماں ہو، نہ جلوہ گر بساطِ خاک پر
غالباً ہر اشک تارا بن گیا افلاک پر

کاش ذرّے بھی نظر آتے کبھی افلاک پر
جیسے تارے ٹوٹ کر گرتے ہیں فرشِ خاک پر

ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا چاہیئے
ڈوبنا برق کہ تکیہ ہے خس و خاشاک پر

ان کی ہر موج تبسم معنئ بے لفظ ہے
اجتہادی تبصرہ کیجئے دلِ غمناک پر

آپ کی برگشتہ نظروں کے تقاضے، الاماں
لب کشائی کفر اس خوابِ اذیت ناک پر

پیکرِ خاکی ہوں میں اس سے کسے انکار ہے
کچھ بنامِ تبصرہ اب جوہرِ ادراک پر

ابتدائے ذکر و فکر غم تھا میرا مشغلہ
اب زباں کھلتی نہیں اس شعلۂ بیباک پر

خوابِ تعمیر و ترقی اور اخلاقی زوال
پہلے کچھ سعیِ رفو ہو دامنِ صد چاک پر

کیوں مآلِ لغزشِ آدم کی یہ ہم رنگ ہے
کس خطا میں چاندنی پھینکی گئی ہے خاک پر

سامنے آئینۂ تجلی کا اثر جو کچھ بھی ہو
عقل پر، ادسان پر، احساس پر، ادراک پر

ہم سرِ ساحل جلا دیتے تھے اپنی کشتیاں
زندگی کو ناز تھا اس جرأتِ بیباک پر

"نائبِ یزداں" بھی، مسجودِ ملائک بھی، عروج
اللہ اللہ! یہ نوازش ایک مشتِ خاک پر

غزل

چندر پرکاش جوہر بجنوری

انقلاباتِ جہاں سے زہر اساں دیکھا
میں نے ہر دور میں شاعر کو غزل خواں دیکھا

خار و گل کی کوئی تخصیص گلستاں میں نہیں
سب پہ یکساں کرمِ فصلِ بہاراں دیکھا

تیرے غم سے بھی علاجِ غمِ دوراں نہ ہوا
تیری زلفوں کی طرح سب کو پریشاں دیکھا

لذتِ حسرتِ ساحل کوئی اس سے پوچھے
جس نے ہر موج کے آغوش میں طوفاں دیکھا

ہائے وہ طائرِ محرومِ نشیمن جس نے
آنکھ کھلنے بھی نہ پائی تھی کہ زنداں دیکھا

ہر نفس اک نئی منزل کے لئے ہے بیتاب
کتنا بیدار ہے یہ آج کا انساں دیکھا

اس کی اک یادِ مسلسل کے سوا اے جوہر
میں نے کوئی نہ انیسِ شبِ ہجراں دیکھا

غزل

از بسنت کمار بسنت ایڈوکیٹ .... رکاب گنج، لکھنؤ ۳

میکدۂ حرم میں جا شیشۂ غم اٹھا کے دیکھ
ہوتی ہے کیسی بے خودی پی کے ذرا پلا کے دیکھ

کارگہِ جہاں میں تو خود کو بھی آزما کے دیکھ
عزم و عمل کی راہ میں شمعِ یقیں جلا کے دیکھ

مہر و وفا، خلوص پیار ڈھونڈھ نہ طائرِ ہوس
دورِ ہوس میں خود پرست اپنی ہوس مٹا کے دیکھ

ہو نہ مریدِ زندگی، گم نہ ہو کائنات میں
ذہن و خرد کی آنکھ کھول نورِ ازل کو پا کے دیکھ

رہزنِ راہِ صدق ہیں تیری ہوس کی ظلمتیں
اپنے ضمیر و قلب کو راہ نما بنا کے دیکھ

اتنا ہوس پرست کیوں ہستیٔ مستعار میں
توڑ طلسمِ بے خودی زعمِ خودی مٹا کے دیکھ

عشرتِ چند روزہ چھوڑ عشرتِ دائمی کو ڈھونڈھ
دیر و حرم کے در پہ تو اپنی جبیں جھکا کے دیکھ

گردشِ روزگار سن چھیڑ نہ تو بسنت کو
حوصلہ ہو اگر تجھے تو اسے آزما کے دیکھ

مطبوعاتِ جدیدہ

تفسیرِ سورۃ القیامۃ (عربی) مرتبہ المعلم عبد الحمید الفراہیؒ، تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، طباعت ٹائپ، صفحات ۴۸، قیمت سات روپئے، پتہ: مکتبہ دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، اعظم گڈھ۔

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ نے کلام مجید کی جن سورتوں کی تفسیر لکھی ہے، ان میں سورۂ قیامہ کی تفسیر سب سے پہلے لکھی تھی، کیونکہ ان کے نزدیک قرآن مجید کی طرح اس کی ہر سورہ کے مختلف اجزا میں بھی نظم و ترتیب ہے، اور بظاہر اس سورہ میں بڑا اقتضاب پایا جاتا ہے، اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ اس میں کوئی ربط و نظم نہیں ہے، اس لئے مولانا نے اپنے اصول و نہج کے مطابق اس کی تفسیر لکھی، اور دلائل سے ثابت کیا کہ یہ سورہ بھی از اول تا آخر مرتب و مربوط ہے اور اس کا ماقبل و مابعد کی سورتوں سے بھی نہایت گہرا تعلق ہے، یہ کتاب پہلی دفعہ مولانا کی زندگی میں مطبع عام علی گڈھ سے شائع ہوئی تھی، نظر ثانی کے وقت انہوں نے اس میں رد و بدل کر دیا تھا، اب دائرہ حمیدیہ نے اس کا اصلاح و ترمیم شدہ نسخہ پہلی دفعہ شائع کیا ہے، اس میں سورہ کے عمود، ماسبق و مابعد سے تعلق، اسلوب و استدلال کی نوعیت، قسموں کی وضاحت اور قیامت اور نفس لوامہ کی باہمی مناسبت وغیرہ پر نہایت مفید اور عالمانہ بحث کی ہے، اس کے علاوہ بعض مشکل فقروں اور آیتوں کی بڑی دلنشین تشریح کی ہے، جس سے مشکل لفظوں کی تحقیق، اسلوبِ کلام کی خوبیاں اور بلاغت کے محاسن بھی پوری طرح نمایاں ہو گئے ہیں، اس کتاب کی دو بحثیں زیادہ اہم ہیں، ایک جمع شمس و قمر کی کیفیت کے بارہ میں منکرین و متشککین کا جواب، دوسری جمع و ترتیبِ قرآن جس کے بارہ میں مصنف علام کا نقطۂ نظر یہ ہے، کہ قرآن عہد نبویؐ میں وحی الٰہی سے مرتب کیا جا چکا تھا،

انہوں نے اس عام اور مشہور خیال کی تردید بھی کی ہے، کہ فرقۂ امامیہ قرآن کے بعض حصّوں کے باقی اور محفوظ نہ رہنے کا قائل ہے، کیونکہ یہ اس کے محققین علماء کی تصریحات کے خلاف ہے (ص ۲۶) یہ کتاب مولانا کے عمیق مطالعۂ قرآنی کا نتیجہ ہے، اور اس سے ان کی عالمانہ و مجتہدانہ بصیرت، نکتہ رسی، دقیقہ سنجی اور قوت استدلال کا اندازہ ہوتا ہے، اس کا اردو ترجمہ بھی دائرہ حمیدیہ سے مل سکتا ہے۔

سیرۃ الصدیق رضؓ:- مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۶۸، مجلد، قیمت -/۷/۵۰۔ پتہ: صدر دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، سلطان جہاں منزل، علی گڑھ،

نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم نے پون صدی قبل یہ کتاب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم کی فرمائش پر علی گڑھ کے طلبہ کے لئے لکھی تھی، جو بہت مقبول ہوئی، اب ان کے خلف الرشید الحاج مولوی عبید الرحمٰن خاں شروانی کی توجہ اور علم دوستی کے نتیجہ میں اس کا چوتھا ایڈیشن اہتمام سے شائع ہوا ہے، اس کے چار ابواب میں خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات، مناقب اور کارنامے مستند مآخذ سے اختصار مگر جامعیت کے ساتھ دلآویز و دلکش پیرایہ میں قلمبند کئے گئے ہیں، پہلے باب میں نام ونسب، لقب اور والدین کے ذکر کے بعد ان کے مشرف بہ اسلام ہونے سے وفات نبوی ﷺ تک کے واقعات و حالات درج ہیں، دوسرے باب میں عہد خلافت کے کارنامے، فتوحات، اصول حکومت، علمی کمالات، حبّ رسول اور ازواج و اولاد کا تذکرہ ہے، تیسرے باب میں حضرت ابوبکر رضؓ کے فضل و منقبت سے متعلق آیات و احادیث کے علاوہ صحابۂ کرام رضؓ بشمول حضرت علی رضؓ کے اقوال جمع کیے گئے ہیں، چوتھا باب حضرت ابوبکر رضؓ کے ادبیات پر مشتمل ہے، اور آخر میں کتاب کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے، اب تک حضرت ابوبکر رضؓ کی مبسوط سوانح عمریاں لکھی جاچکی ہیں، لیکن جہاں تک سادہ واقعات و حالات اور سیرت صدیقی کے اہم پہلوؤں کا تعلق ہے، وہ سب اس کتاب میں بھی بکمال ایجاز موجود ہیں، مزید برآں ترتیب

میں حسن و جاذبیت، انداز بیان میں دلآویزی و دلپذیری اور مولانا کی انشا اور طرز نگارش کی حلاوت و دلکشی بھی ہے، علاوہ ازیں انہوں نے حبِ ایمانی جذبہ اور روحانی جوش و سرمستی کے ساتھ یہ کتاب لکھی ہے اس کی وجہ سے یہ بڑی پُر اثر اور کیف آگیں ہوگئی ہے۔

حیاۃ المحدث شمس الحق و اعمالہ (عربی): مرتبہ مولوی محمد عزیر سلفی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ بہتر، طباعت ٹائپ، صفحات ۳۴۶، قیمت تحریر نہیں، پتے:- (۱) مکتبہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، وارانسی (۲) ابناء الجامعۃ السلفیۃ ص، ب ۲۸۹ المدینۃ المنورۃ، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ۔

مولانا شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادیؒ، مولانا سید نذیر حسین محدث دہلویؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور خود بھی بلند پایہ محدث اور ممتاز صاحب علم تھے، ان کی زندگی حدیث کی خدمت، نادر کتب حدیث کی اشاعت اور احیائے سنّت و رد بدعت کے لئے وقف تھی، اور انہوں نے متعدد بلند پایہ کتابیں بھی تالیف کیں، جن میں سنن ابی داؤد کی شرح عون المعبود اور غایۃ المقصود کو بڑی قبولیت نصیب ہوئی، زیر نظر کتاب میں مولانا کے حالات و سوانح، خدمات اور کارنامے تین حصّوں میں قلمبند کئے گئے ہیں، پہلے حصّہ میں خاندانی حالات، ولادت، تعلیم، روزمرّہ اشغال، درس و تدریس، تصنیف و تالیف، تقریر و خطابت اور فتویٰ نویسی کے متعلق معلومات درج ہیں، اور ان کی سیرت و شخصیت، اخلاق و عادات اور فضل و کمال کی تصویر کشی ان کے معاصر و غیر معاصر علماء کے اقوال کی روشنی میں کی گئی ہے، دوسرے حصّہ میں علمی کارناموں کا حال بیان کیا گیا ہے، اور تصنیفات کا مفصل تعارف کرایا گیا ہے، اسی حصّہ میں ان کتابوں کا ذکر بھی ہے، جو مولانا کی جانب منسوب کی گئی ہیں، لیکن مصنف کے خیال میں یہ درست نہیں ہے، آخری حصّہ میں مولانا شمس الحق کے ۱۸ اساتذہ، ۸ تلامذہ اور ۲۰ معاصرین کا مختصر خاکہ قلمبند کیا ہے، اور حواشی میں ان کتابوں کی نشاندہی کی ہے، جن میں ان حضرات کے

حالات درج ہیں، مصنف ابھی نوجوان ہیں، یہ کتاب انہوں نے مدرسہ کی طالب علمی کے زمانہ میں لکھی ہے، اور اب بھی وہ جامعہ ام القریٰ میں زیر تعلیم ہیں، مگر جس محنت، جانفشانی اور تلاش و جستجو سے یہ کتاب لکھی ہے، اس کے لئے وہ حوصلہ افزائی و تحسین کے مستحق ہیں، اس سے ان کی شاندار اٹھان کا پتہ چلتا ہے، لیکن عدم تجربہ کی وجہ سے اس میں غیر ضروری اور بیجا طوالت ہو گئی ہے، اہم اور غیر اہم سب ہی باتوں کا جزئی استقصا کیا ہے، اور معمولی کتابوں کا بھی بہت مفصل تعارف کرایا ہے، غایۃ المقصود کی ۳۲ جلدیں مرتب کئے جا چکنے کی جو وجہیں بیان کی ہیں، وہ محل نظر اور غیر تشفی بخش ہیں، اصلاً یہ وہ مضمون ہے جو پہلی دفعہ "معارف" میں شائع ہوا تھا، مگر دیباچہ میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے۔

نقد و سخن :- مرتبہ ڈاکٹر طلحہ رضوی برق صدر شعبۂ اردو و فارسی جین کالج آرہ، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۷۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت تیس ۳۰ روپئے، پتے: (۱) دانش کدہ، ملکی محلہ، آرہ، (۲) بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔

یہ مصنف کے چودہ ۱۴ ادبی مضامین کا مجموعہ ہے، چند کے سوا سب مضامین میں بہار کی علمی و ادبی شخصیتوں کے حالات و کمالات پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، ابتدا کے تین مضامین اقبال کے متعلق ہیں، پہلے میں اقبال کو اسلامی شاعر بتانے کے بعد ان کی شاعری کی روشنی میں زن کامل کے متعلق ان کا تصور پیش کیا گیا ہے، دوسرے مضمون میں شاعری میں علامت نگاری کی اہمیت واضح کی ہے، اور اقبال کی علامت نگاری اور مخصوص علامتوں خودی، عشق، فکر، قلندری، جذب، بے خودی، شاہین، عقاب اور مرد مومن وغیرہ کی وضاحت کی گئی ہے، تیسرے مضمون میں رباعی کی فنی اہمیت، اس کی بحر اور مخصوص اوزان وغیرہ پر گفتگو کی ہے، اور ان لوگوں کی تردید کی ہے جو اقبال کی دو بیتیوں کو رباعی قرار دیتے ہیں، چوتھا مضمون اس حیثیت سے زیادہ اہم ہے کہ اس میں شاعری کے لئے وزن، آہنگ اور عروضی پابندی کو ضروری بتایا ہے، مصنف کے نزدیک قواعد عروضی سے انحراف، آزاد و معری اور ناموزوں نظمیں فرانسیسی شعراء کی اختراع ہیں،

جس سے اردو فارسی شاعری نے بھی اثر قبول کیا، سعدی کی شہرۂ آفاق کریما پر ایک دلچسپ اور لائق توجہ مضمون بھی ہے، گو کلیات کے مجموعے اور محققین کی تحریریں اس کے ذکر سے خالی ہیں، مگر کریما کا کوئی مدعی کسی عہد میں نہیں ہوا، اس لئے مصنف اسے سعدی ہی کے فکر و خیال کا ثمرہ قرار دیتے ہیں، جس طرح امیر خسرو کی مشہور غزل "نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم" ان کے کسی دیوان میں نہ ہونے کے باوجود ان ہی کی سمجھی جاتی ہے، اور "مرحبا سید کی مدنی العربی" کو بجا طور پر قدسی کی کہا جاتا ہے، ضلع شاہ آباد کے ایک ہیڈ ماسٹر بابو پرماتند صبر آروی نے کریما کے جواب میں "رحیما" لکھی تھی، مصنف نے اس کا ذکر کرکے دونوں کے اشعار مقابلۃً نقل کئے ہیں۔ بیدل اور تلمیذ غالب شاہ باقر علی آروی پر ایک ایک مضمون ہے۔ موخر الذکر اس ادبی معرکے کے ہیرو تھے، جو غالب کی قاطع برہان کے رد میں آغا احمد علی احمد کی کتاب مؤید برہان کی وجہ سے بپا ہو گیا تھا، اور جس کے نتیجہ میں "ہنگامۂ دل آشوب" تصنیف کی گئی تھی، ڈاکٹر رضوی نے اس معرکہ کی تفصیل تحریر کی ہے، اردو شعراء میں جمیل مظہری اور حبیب آروی کی غزل گوئی اور رضا نقوی واہی کی مزاحیہ شاعری پر مضامین ہیں، سہیل عظیم آبادی کو ان کے افسانوں کی روشنی میں سیکلر اور انسان دوست بتایا ہے، اور ش مظفر پوری کے ناول کھوٹا سکہ کے موضوع اور کرداروں کی خصوصیات دکھائی ہیں، ان کے ناول کو مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان ادا کے مماثل قرار دینے پر ممکن ہے کچھ لوگوں کو اختلاف ہو، ایک مضمون میں وحید الہ آبادی اور ان کے بیس تلامذہ کا مختصر تذکرہ ہے، مضمون نگار نے وحید کو آتش کا شاگرد بتا کر اس بارہ میں حکیم مولانا عبدالحی صاحب گل رعنا کے بیان کی تردید کی ہے، مولانا سید سلیمان اشرف کی سیرت و سوانح پر ایک دلچسپ مضمون ہے، لیکن اس میں مولانا حسین احمد مدنی اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین کے تعلق سے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، وہ بلا ثبوت و حوالہ اور محل نظر ہیں، متعدد جگہ فرد بمعنی شخص کو مؤنث اور اساطین کا املا اساتین لکھا ہے،

نجوم خلافت :- مرتبہ مولوی عثمان احمد قاسمی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت

بہتر، صفحات ۸۰، قیمت للعہ پتہ:- علمی کتاب گھر، شاہ گنج جونپور۔

مصنف نے کچھ عرصہ پہلے بچوں کے لئے آسان زبان میں "سب کے نبیؐ" کے نام سے ایک کتابچہ لکھا تھا، جو مقبول ہوا، اور مکاتب اسلامیہ کے نصاب میں داخل کیا گیا، یہ بھی اسی طرح کی مفید اور عام فہم کتاب ہے، اور اس میں خلفائے راشدین کے حالات و واقعات قلمبند کئے گئے ہیں، اختصار، مناسب ترتیب، آسان زبان اور اچھے پیرایۂ بیان کی وجہ سے یہ بھی مکاتب کے نصاب میں شامل کئے جانے کے لائق ہے۔

صبح صادق :- تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۶۰ مجلد گرد پوش، قیمت دس روپے، ناشر انجمن تحفظ تقدیس ادب قصبہ جلالپور ضلع فیض آباد۔

قصبہ جلالپور، ضلع فیض آباد کے خوش مذاق لوگوں نے تحفظ تقدیس ادب کے نام سے ایک انجمن قائم کی ہے، نعتوں کا یہ انتخابی مجموعہ انجمن کی پہلی پیش کش ہے، جو پندرہویں صدی ہجری کے آغاز کی مناسبت سے شائع کیا گیا ہے، یہ جلال پور اور اس سے متصل نگ پور کے تقریباً دو درجن شعراء کے نعتیہ کلام پر مشتمل ہے، اکثر شاعروں نے انجمن کی جانب سے دیئے گئے طرحی مصرعہ ع دونوں عالم پر محمدؐ کا بہت احسان ہے، پر طبع آزمائی کی ہے، اس کے علاوہ ہر شاعر کی چند غیر طرحی نعتیں بھی دی گئی ہیں، مجموعہ کی ابتدا و انتہا کلام اقبال سے کی گئی ہے، ابتدا میں کلام اقبال ع خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ کے بعد انور جلالپوری کی ایک حمد بھی ہے، اور خاتمہ ڈاکٹر اقبال کی مشہور منظوم دعا ع یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے، پر ہوا ہے، شروع میں دارالمصنفین کے ناظم جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں عربی، فارسی اور اردو میں نعت گوئی کی مختصر تاریخ اور زیر نظر مجموعہ کی اکثر نعتوں کے بہترین اشعار پر مؤثر انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے، جس جذبہ سے یہ کتاب شائع کی گئی ہے، وہ قابل تحسین ہے۔

«ض»

جلد ۱۳۲ ماہ ذی قعدہ ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۸۳ء عدد ۳

مضامین

تصحیح

اگست ۱۹۸۳ء کے معارف میں ڈاکٹر حمید اللہ کے ایک خط پر اظہار رائے کے عنوان سے جو دو خطوط شائع ہوئے ہیں، ان میں دوسرا خط کلکتہ کے جناب آغا رشید مرزا دہلوی صاحب کا ہے، جن کا نام سہواً لکھنے سے رہ گیا ہے، ناظرین تصحیح فرمالیں،

اڈیٹر